سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر: خرم مُراد

ادارہ ترجمان القرآن



اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے حسین دامن میں
ایک نیا دلپذیر شہر

منظرِ کوہسار

ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں، سیوریج بجلی، پانی، سکول، کمیونٹی سنٹر، قبرستان، مسجد اور ہسپتال، خوبصورت جھیل۔ ترقیاتی کام جاری ہیں۔

قیمت 30 ہزار روپے فی مرلہ مگر عیدالفطر سے پہلے بکنگ کرانے پر 3 ہزار روپے فی مرلہ کی خصوصی رعایت 3 ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے ڈرافٹ بھیج کر بکنگ کرالیں۔ باقی رقم تین سال کی قسطوں میں کنال 600 مربع گز

پمفلٹ مفت منگوائیں۔

فیروز پور روڈ پر چونگی امرسدھو سے 2 کلومیٹر
ایل ڈی اے سے منظور شدہ

شاداب کالونی

کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد، ڈسپنسری، سکول، مارکیٹیں، ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولت موجود۔ سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر۔
ترقیاتی کام جاری ہیں، کنال 500 مربع گز

قیمت 30 ہزار روپے فی مرلہ مگر عیدالفطر سے پہلے بکنگ کرانے پر 3 ہزار روپے فی مرلہ کی خصوصی رعایت 3 ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے ڈرافٹ بھیج کر بکنگ کرالیں۔ باقی رقم تین سال کی قسطوں میں

پمفلٹ مفت منگوائیں۔

ہم ذوق ہم خیال احباب کی خوبصورت نظریاتی بستی

دیگر قریبی سوسائیٹیوں سے انتہائی کم قیمت پر نظریاتی ماحول کیلئے سنہری موقع

تحریکِ اسلامی سے وابستہ
افراد کا بااعتماد ادارہ

مری میں ایک نئے منصوبے کا
اعلان

ہل ویو
اپارٹمنٹ

مال روڈ مری سے پیدل پانچ منٹ کی مسافت پر پچاس فٹ چوڑی جھیکا گلی روڈ (لوئر مال کے اختتام پر)
مری امپرومنٹ ٹرسٹ کی سکیم میں اعلیٰ کوالٹی کی تعمیر تمام جدید سہولتوں کے ساتھ ہر اپارٹمنٹ سے وادی کے حسین مناظر، مکمل منصوبہ 20 فلیٹ پہلے آئیے پہلے پائیے کی بنیاد پر بکنگ ہوگی۔
قیمت تعمیر شدہ رقبہ 650 مربع فٹ 6 لاکھ روپے، بکنگ پر 2 لاکھ روپے باقی رقم 18 ماہانہ قسطوں میں۔
پمفلٹ مفت منگوائیں۔

پانچ رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ

ہیڈ آفس ہاؤس 1 اے فیض روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور فون 5869549-5865371 فیکس 5837016

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۲ | ستمبر ۱۹۹۶ء جمادی الاول ۱۴۱۷ھ | عدد ۹

ترتیب

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۵۷۰۱۲۴

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۵ روپے

زر سالانہ -/۱۵۰ روپے

مشرق وسطی -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط -/۴۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

ایسے شخص کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو' مسلمان رہنا چاہتا ہو' اسلام سے نکلنے پر راضی نہ ہو' اور پھر اس کے اقوال یا اعمال' یا دونوں میں کوئی چیز ایسی نظر آتی ہو جو اصول اسلام کے خلاف ہو۔ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ مسئلہ اس شخص کا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی تائید و حمایت میں سرگرمی کا اظہار کرتا ہو' اور اس کے بعض اقوال و اعمال بالکل اصول اسلام کے مطابق ہوں' مگر بعض امور میں وہ اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹا ہوا نظر آئے۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کو مجرد ظہور خلاف کے ساتھ ہی کافر ٹھہرا دینا سخت غلطی ہے۔ اس کی یہ روش بہرحال دو وجوہ میں سے کسی ایک وجہ پر مبنی ہوگی' یا تو وہ منافق ہو گا یا نیک نیتی کے ساتھ کسی ایسی چیز کو اسلام سمجھ رہا ہو گا جو درحقیقت اسلام نہیں ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو قرآن مجید میں منافقین کی اقسام اور ہر قسم کے منافق کی علامات' اور اس کے درجہ نفاق کے لحاظ سے معاملہ کرنے کے طریقے صراحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔ آپ تحقیق کیجیے کہ آیا میں اس میں کسی درجہ نفاق کی علامات پائی جاتی ہیں یا نہیں اور جب کوئی درجہ متحقق ہو جائے تو اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیجیے جیسا اس درجہ کے منافق کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا' اور اللہ کے رسول نے اختیار کیا ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہے' تو اس کا یہ فعل کہ وہ غیر اسلام نہیں بلکہ عین اسلام ہی سمجھ کر کوئی بات کہہ رہا ہے' خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی نیت کفر کی نہیں ہے بلکہ وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ پھر اس کو نکال پھینکنے میں آپ کیوں اس قدر جلدی کرتے ہیں۔ پہلے تحقیق کیجیے کہ اس کے اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ یہ چیز اس میں کہاں سے آئی؟ اور کیوں اس نے ایسی چیز کو اختیار کیا؟ اس کے اقوال و اعمال پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیے' خود اس سے تبادلہ خیال کیجیے اس کے نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ بہت ممکن ہے کہ بعض ظاہری چیزوں کو دیکھ کر آپ خود ہی اس کے متعلق غلط فہمی میں پڑ گئے ہوں' اور جو کچھ دور سے آپ کو غیر اسلام نظر آیا تھا' وہ دراصل اسلام ہی ہو۔ اگر تحقیق سے یہ بات کھل جائے تو فرح و سرور کے ساتھ اسے گلے لگائیے اور اللہ سے استغفار کیجیے کہ آپ نے ایک مسلمان سے بدگمانی کی۔ اور اگر ثابت ہو کہ دراصل سمجھ کے پھیر نے اسی کو فی الواقع غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے تو اس کو سمجھائیے۔ جس طرف سے اس کے دماغ میں غلط فہمی پہنچی ہے' اسی طرف سے فہم صحیح اس کے اندر پہنچانے کی کوشش کیجیے۔ جن شکوک و شبہات نے اسے مرکز اسلام سے دور ہٹایا ہے ان کی اصل کو سمجھ کر حکمت و دانائی کے ساتھ رفع کیجیے - کامیابی ہو جائے تو وہ عذاب سے بچا اور آپ ثواب کے مستحق ہو گئے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی "اشارات" جلد ۹' عدد ۱' رجب المرجب ۱۳۵۵' ستمبر ۱۹۳۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گرہ بھنور کی کھلے تو کیوں کر

خرم مراد

ملک کی کشتی جس انتہائی خطرناک بھنور میں پھنسی ہوئی ہے' اس سے نکلے تو کیوں کر؟ یہ سوال آج ہر دردمند دل کا سوال ہے۔

یہ بات کہ ہمیں اپنی قومی زندگی کا سب سے سنگین بحران درپیش ہے' ہر شخص کی زبان پر ہے۔ یہ بحران کتنا خطرناک ہے' یہ بھی کسی دانا و بینا انسان سے پوشیدہ نہیں۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے' جو (گذشتہ ماہ' انھی صفحات میں) کہی گئی کہ "بگاڑ اس انتہا کو پہنچ گیا ہے" کہ "ملک کا وجود خطرے میں ہے" اور "فوری اصلاح نہ ہوئی تو [وہ] بہت بڑی تباہی سے دوچار ہو سکتا ہے"۔ اس حقیقت سے انکار اور اعراض صرف وہی کر رہے ہیں جو "سب اچھا ہے" کی رپورٹ دینے اور لینے میں ہی اپنے اقتدار اور مفادات کی عافیت سمجھتے ہیں۔ یا جو شتر مرغ کی طرح اپنی فوری دلچسپیوں میں سر چھپاکر مطمئن ہیں کہ یہ طوفان گزر جائے گا' ڈوبیں گے تو دوسرے۔

لیکن اس بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس بحران سے نکلنے کی صورت کیا ہو' اور کیا تدابیر اختیار کی جائیں جن سے اصل مرض کا ازالہ ہو جائے۔ ایک بحران سے اس طرح نہ نکلیں کہ دوسرے شدید تر بحران میں مبتلا ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ایک دانا و بینا حکیم فوری طور پر تو ایسی تدابیر کی طرف توجہ دے گا جو بحران کی شدت کم کریں' اور قوم کے مزاج' جسم (polity) اور آب و ہوا (کلچر اور ماحول) میں اتنی اصلاح کریں اور اتنا اعتدال پیدا کریں کہ ایک طرف وہ جان بر ہو سکے' اور دوسری طرف اصل مرض کے علاج کی استعداد پیدا ہو۔ جس طرح ایک شدید بخار کے مریض کے علاج کے لیے سب سے پہلے اس کا بخار کم کرنے کا' پھر معدے کی اصلاح' قوت کی بحالی' اور آب و ہوا کی تبدیلی کا اہتمام کرے گا۔ ایسی فوری اور سیاسی تدابیر پر مشتمل ایک ۱۰۔نکاتی لائحہ عمل (گذشتہ

ماہ انھی صفحات میں) پیش کیا جا چکا ہے ۔ مکمل علاج تو اسی وقت ممکن ہے جب بنیادی مرض کا ازالہ کیا جائے ' لیکن یہ تدابیر اس مستقل ازالے کے لیے بھی ناگزیر ہیں ۔ مثلاً ' اصل مقاصد کے بارے میں یک سوئی ' ان کے حصول کے لیے تمام دینی و سیاسی عناصر کا اتفاق و اشتراک ' اور ایک باایمان اور باکردار قیادت --- یہ ایسی ناگزیر ضرورتیں ہیں جن کے بغیر نہ فوری اصلاح ہو سکتی ہے ' نہ بنیادی ۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سیاسی تدابیر بے کار ہیں ' ضرورت تو اخلاقی اور روحانی سدھار کی ہے ۔ اس لیے سب چھوڑ چھاڑ کر اسی تعمیری کام میں لگ جانا چاہیے ۔ لیکن جہاں ایسی بحرانی کیفیت ہو ' وہاں تعمیری کام کے لیے ذہنی سکون اور ولولہ عمل کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے ' اور بات سننے کی استعداد کہاں سے آ سکتی ہے ۔ اس لیے یہ سیاسی تدابیر ناگزیر ہیں ۔ مگر یہ صحیح ہے کہ تعمیری کام کے بغیر مرض کا مستقل علاج نہیں اور حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ ایمان و اخلاق کی تعمیر کا کام ہر حال میں جاری رہنا چاہیے ۔ آج ہمارا مدعا انھی تدابیر کے بارے میں گفتگو کرنا ہے جو مرض کے اصل اسباب کے علاج کے لیے درکار ہیں ۔

مرض کے اصل اسباب کیا ہیں ' اس بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں ۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصل مرض ' جہالت ہے ' تعلیم عام ہو گی تو حالت سدھر جائے گی ۔ یقیناً تعلیم کے بغیر نہ دل سدھر سکتے ہیں نہ اخلاق ' نہ کردار بن سکتا ہے نہ نظام ۔ نہ دنیاوی و معاشی ترقی ہو سکتی ہے نہ آخرت ہاتھ آ سکتی ہے ۔ لیکن کون سی تعلیم؟ ان کی مراد ہوتی ہے وہی تعلیم جو ہمارے اسکولوں اور مدارس میں دی جا رہی ہے ۔ بس عورت مرد سب پڑھے لکھے ہو جائیں ' شرح خواندگی سو فی صد ہو جائے ' کالجوں کا جال بچھ جائے ' تو قوم ' فلاح کی راہ پا لے گی! لیکن نہ شرح خواندگی میں یہ تاثیر ہے ' نہ لارڈ میکالے کا بخشا ہوا نظام تعلیم ایسا نسخہ کیمیا ہے جو ذرہ برابر بھی مطلوب تبدیلی پیدا کر سکے ۔ بلکہ اس کے برعکس ' یہ تو وہ تیزاب ہے جو سونے کا ہمالہ ہو تو اسے مٹی کا ڈھیر بنا دیتا ہے ' جس کا حاصل فکر معاش کے سوا کچھ نہیں ۔ کیا ہم نہیں دیکھ رہے کہ جو افراد آج ہمارے تمام زوال اور بگاڑ کے اصل ذمہ دار ہیں --- یہ جنرل ' سیاست دان ' بیوروکریٹ ' دانش ور ' صحافی --- یہ سب "تعلیم یافتہ" ہیں ۔ آکسفورڈ اور کیمبرج تک کی ڈگریاں ان کے پاس ہیں ' اگرچہ گالیاں ساری جاہلوں کے حصہ میں آتی ہیں ۔ ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسے جیسے یہ تعلیم پھیلتی جائے گی ' مریض کی حالت بگڑتی جائے گی ۔

کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ اصل مرض تو غربت ہے ' اور معیار زندگی کی پستی ہے ۔ دو وقت کی روٹی ملنے لگے ' معیار زندگی بلند ہو گا ' لوگ خود بخود سدھر جائیں گے ۔ یقیناً فاقہ کفر تک لے جاتا ہے '

اور غربت کا ازالہ ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ مگر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں ملک تباہ و برباد ہو رہا ہے، ان میں سے ہر ایک امیر کبیر ہے، اس کے پاس سونے کی کئی کئی وادیاں ہیں، مگر اس کی بھوک برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ معاشی فراغت سب کو نصیب ہونا چاہیے۔ لیکن لوگوں میں معیار زندگی بلند کرنے کی ہوس اور دوڑ جتنی بڑھے گی، ہمیں تو یقین ہے اتنی ہی ہماری قومی بدحالی بڑھے گی، تفرقہ، انتشار اور خون ریزی میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوگا۔

کچھ اور لوگوں کے نزدیک اصل سبب یہ ہے کہ ملک ٹیکنولوجی اور معاشی ترقی کے لحاظ سے پس ماندہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنولوجی میں آگے بڑھیں گے، تجارت بڑھے گی، کارخانے لگیں گے، ملک کی حالت سدھر جائے گی۔ بے شک معیشت اور ٹیکنولوجی میں ترقی ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو ملک ترقی یافتہ ہیں، ان کی معاشی ترقی ان کے کردار اور استحکام کی مرہون منت ہے، نہ کہ ترقی سے انھیں کردار و استحکام ملا ہے۔ پھر ٹیکنولوجی اور معیشت کی ترقی کے زہریلے پھلوں سے وہ خود تنگ ہیں۔ ایک ماہر معاشیات، کمیونسٹ دوست کہا کرتے تھے کہ معاشی ترقی صرف برائے ترقی کبھی نہیں ہو سکتی، جب تک وہ کسی بالاتر تہذیبی یا اخلاقی مقصد کی خاطر نہ ہو۔

نظام حکومت کی اصلاح کا مسئلہ تو بہت سے لوگ بکثرت اٹھاتے ہیں۔ گویا یہ کوئی "کھل جا سم سم" کا جادوئی نسخہ ہے جس سے اصلاح کے خزانوں کے سارے دروازے کھل جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے کہ صدارتی نظام ہو، کسی کی رائے میں فوج کا دستوری رول سارے مسائل حل کر دے گا، کسی کے نزدیک موجودہ سسٹم کی بقا ہی شاہ کلید ہے۔ کوئی مطلق العنانی کا خواہاں ہے، کوئی فوری انتخاب چاہتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ انتخاب ایک عرصے کے لیے ملتوی کر دو، ۵ سال میں ۴ انتخاب ہو گئے مگر مریض کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان میں سے کون سا نظام ہے جو نصف صدی کی مختصر زندگی میں ہم نے نہیں آزمایا؟ پارلیمانی نظام موجود ہے، صدارتی نظام بھی طویل مدتوں کے لیے رہا ہے، مارشل لا بھی لگا رہا ہے، جمہوریت بھی رہی ہے، فرد واحد کی مطلق العنانی بھی رہی ہے، اداروں کی حکومت بھی رہی ہے، بنیادی جمہوریت بھی رہی ہے، اور بالواسطہ انتخابات بھی ہوئے ہیں، بالغ رائے دہی بھی رہی ہے اور بلاواسطہ انتخاب بھی، لمبے لمبے عرصوں کے لیے انتخابات موخر بھی رہے ہیں۔ منتخب نمایندوں کے لیے دستوری شرائط عائد کرنے والے نے اپنی مطلق مرضی سے اپنے معیار کے مطابق نمایندے منتخب کر کے وزرا اور ممبران بنائے، لیکن وہ کسی طرح بھی آج کے وزرا اور ممبران سے بہتر نہ تھے بلکہ وہی بیش تر چہرے آج بھی حکمران ہیں یا حکمرانی کے امیدوار۔ پھر الیکشن کمیشن سے اس چیز کو نافذ کرنے کا مطالبہ تو ایک فعل عبث ہے جسے نہ مارشل لا نافذ کر سکا، نہ حکومت یا معاشرہ اسے نافذ کرنے کے لیے تیار ہے۔

یہ حقائق ہمارے سامنے ہیں۔ اگر ہم آنکھیں بند کر کے، جانتے بوجھتے سراب کے پیچھے ہی دوڑتے رہیں گے تو آب حیات ہمیں کیسے ملے گا؟ پھر کیا آب حیات کے چشمہ کی یافت، اور اس تک پہنچنے کی آرزو اور جستجو ہی ہماری آج کی سب سے بڑی ضرورت نہیں؟ کیا اس کے بغیر یہ ممکن ہے کہ ہم بحران کے اندھیرے طوفانوں سے نکل کر استحکام و ترقی کی روشن چٹان پر لنگر انداز ہو سکیں؟

مادی اسباب ---- سیاسی ہوں یا معاشی، سماجی، طبعی---- نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ حالات و حوادث انھی اسباب کی بنا پر پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ فطرتاً آدمی کی فکر و نظر انھی اسباب میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ انھی کو حالات و حوادث کے وقوع کی توجیہ کے لیے کافی سمجھتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ مغربی تہذیب نے جس کی بنیاد ہی مادہ پرستی (materialism) پر ہے---- ہر واقعہ اور حالات کی توجیہ صرف مادی اسباب سے کرنے کے فلسفے کو اپنی انتہائی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اس نے ایک آنکھ بند کر لی ہے، اور وہ صرف دوسری آنکھ سے دیکھتی ہے۔ وہ ہر غیر مادی توجیہ سے انکاری ہے۔ یہ انکار اس کی پیشانی پر لکھا ہوا عیاں ہے۔

کسی بھی صورت حال کی اصلاح کے لیے اس کے پاس ایک ہی نسخہ ہے: مادی تدابیر و ذرائع کا نسخہ۔ کوئی اور تدبیر بھی کارگر ہو سکتی ہے، وہ اس سے بھی انکاری ہے۔ مسلمان، اسلام کا غلبہ کیوں چاہتے ہیں؟ اس لیے کہ پس ماندہ اور بدحال ہیں۔ اس کا علاج کیا ہے؟ خوش حالی اور معاشی ترقی۔ ورنہ جبر و استبداد۔ چنانچہ اگر ہمارے بیش تر راہ نما، صحافی اور دانش ور انھی اسباب اور علاجوں میں سرگرداں ہیں جو مادی ہیں، تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

مگر مادی اسباب کے پردے کے پیچھے غیر مادی اسباب بھی ہیں۔ انسان کی نگاہ کے لیے ان تک پہنچنا ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ اور آج مغرب کی وضع کردہ دنیا میں (حقیقی دنیا میں نہیں) جو سائنس، ٹیکنولوجی اور مادیت پر قائم ہے---- یہ اس کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ اب وہ ان تک پہنچنا چاہتی ہی نہیں، اس لیے کہ وہ ہر ایسے سبب کے امکان سے انکار کر چکی ہے۔ دن اس لیے نکلتا ہے کہ سورج گردش کرتے ہوئے افق پر نمودار ہو جاتا ہے۔ بارش اس لیے ہوتی ہے کہ بادل آتے ہیں اور ان کو مناسب طبعی احوال فراہم ہو جاتے ہیں۔ زلزلہ اس لیے آتا ہے کہ زمین کے دو تحتی طبقات جس مقام پر ملتے ہیں، وہاں حرکت ہوتی ہے۔ اس سب کے پیچھے کوئی "وہم" ہیں جو رات میں سے دن کو نکالتے ہیں، بادلوں سے پانی گراتے ہیں، زمین سے کھیتی اگاتے ہیں، زمین کے دو طبقات کو حرکت دیتے ہیں، یہ بات نگاہ دیکھ نہیں سکتی، زبان اقرار بھی کرتی ہے تو دل یقین سے محروم ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز، جاہلانہ اور ناقابل یقین بات تو "آج" کے نزدیک ہو ہی نہیں سکتی کہ کہا جائے کہ آتش

نشاں اس لیے بھی پھٹتا ہے کہ لوگ بدکاری کرتے ہیں، زلزلہ اس لیے بھی آتا ہے کہ لوگ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، ذلت اور مسکنت اس لیے بھی مسلط ہوتی ہے کہ لوگ اپنے عہد سے بے وفائی کرتے ہیں، بارشیں اس لیے بھی ہوتی ہیں اور پیداوار میں اضافہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ لوگ اپنی غلطیوں پر نادم ہوتے ہیں اور ان کی اصلاح کرتے ہیں۔

مادی اسباب سے ماوراعالم میں --- عالم غیب میں --- جو اسباب کارفرما ہیں، ان کو دریافت کرنے کے لیے نگاہ و عقل کافی نہیں۔ ان کی طرف راہنمائی وہی روشنی کر سکتی ہے جو عالم غیب سے آتی ہے۔ جس طرح مادی اسباب کی تلاش کے لیے وہی روشنی ضروری ہوتی ہے جو عقل و حواس اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔ رسالت محمدیؐ اسی روشنی کا سراج منیر ہے۔ اس سے زیادہ رنج والم کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس پاکستان میں، جو بنا ہی تھا اس رسالت کے اتباع میں، جس کا مقصد ہی تھا اس رسالت کے پیغام کو اجاگر کرنا، آج اسی پاکستان میں ملک کے بارے میں ساری بحث و گفتگو رسالت کی روشنی سے بے نیاز ہو کر ہو رہی ہے۔

یہ باتیں صاف اور واضح ہیں، بدیہی ہیں۔ ان کے بارے میں اتنی تفصیل اظہار مدعا کے لیے ضروری نہ تھی۔ لیکن یہ مدعا قارئین کے دلوں میں اتر جائے، یہ ہمارا مقصود تھا۔ اب اس یقین کی روشنی میں رسالت محمدیؐ کے نور کی طرف رجوع کیجیے تو بات عیاں ہے۔ لوگوں پر ذلت و مسکنت مسلط ہوئی تو اس لیے کہ وہ "آیات الٰہی کا انکار (قول و عمل سے) کرنے لگے تھے"، اس لیے کہ وہ "نافرمانیوں پر اتر آئے تھے، اور ظلم و زیادتی پر تل گئے تھے"۔ لعنت کی گئی تو اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے بے وفائی کی۔ ایک مطمئن و پرامن بستی کو بھوک (معاشی بدحالی) اور خوف کے لباس کا مزہ اس لیے چکھایا گیا کہ "وہ اللہ کے انعامات کی ناشکری کیا کرتی تھی"۔ یہ رہے عاد، ان کو سات دن رات کے طوفان (tornado) نے اس لیے تہس نہس کر دیا کہ یہ "اپنے رب کے پیغامات کا انکار کرتے تھے، رسولوں کی نافرمانی کرتے تھے، اور جو سرکش و جابر مخالف تھے ان کے پیچھے چلتے تھے"۔ کتنا بیان کیا جائے، قدم قدم پر یہی پیغام اور سبق ملتا ہے۔ کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، سائنس اور ٹیکنولوجی سے ناواقف تھے، غریب تھے، معاشی طور پر پس ماندہ تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار، یہ سبق بھول کر، اپنے مسائل حل کرنے کے لیے انھی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں جو دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ لال بجھکڑوں کی طرح انھی نسخوں میں شفا اور نجات تلاش کر رہے ہیں جنھوں نے آج تک کسی کو شفا نہیں بخشی۔ نہ آج ہمیں بخش رہے ہیں۔ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے۔

اصل سبب، اس میں کوئی شک نہیں، جیسے (گذشتہ ماہ) نشان دہی کی گئی "اللہ تعالیٰ سے بے وفائی اور اس عہد کی خلاف ورزی ہے جو تحریک پاکستان کے دوران خدا اور خلق کے ساتھ کیا گیا تھا، اس کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ سے اپنا عہد وفا کریں۔ قرآن کے الفاظ میں، اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ، تم مجھ سے اپنا عہد وفا کرو، میں تم سے اپنا عہد پورا کروں گا۔

لیکن ہم بات وفائے عہد کے وعظ و نصیحت پر ختم کرنا کافی نہیں سمجھتے۔ بے وفائی کی تہہ میں کچھ اور امراض ہیں، جو اس بے وفائی کا باعث بنتے ہیں۔ ہم انھیں سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے کہ دراصل ان ہی کا علاج ضروری ہے۔ ہم قوت کے ان خزانوں کی نشاندہی بھی کرنا چاہتے ہیں جن سے نہ صرف یہ علاج ہو سکتا ہے، بلکہ جن کے بغیر قوم میں وفائے عہد کی استعداد پیدا نہیں ہو سکتی۔

بنیادی مرض کیا ہے؟ ہوائے نفس کی بندگی، دلوں اور زندگیوں میں ہوا و ہوس کی حکمرانی۔ انسانی زندگی میں سارا فساد، شرک اور بت پرستی سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک وہ بت ہوتے ہیں جو نظر آتے ہیں۔ ان کو خدا بنانے پر آدمی پر مشرک ہونے کا فتویٰ لگ سکتا ہے۔ دوسرے وہ بت ہوتے ہیں، جو چھپ چھپ کر دلوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی پرستش پر مشرک کا فتویٰ نہیں لگ سکتا۔ لیکن ان کی پرستش اور ان سے محبت اسی طرح ٹوٹ کر کی جاتی ہے، جس طرح اللہ سے کرنا چاہیے۔ جب اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہو، اور اس سے بڑھ کر کسی اور سے محبت ہو، جب ہی آدمی اللہ سے بے وفائی کرتے ہیں۔ ان بتوں میں سب سے بڑا بت ہوائے نفس ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ، بھلا دیکھو تو اس شخص کو جس نے بنا لیا اپنا حاکم و معبود اپنی خواہشِ نفس کو۔ (الفرقان ۲۵: ۴۳، الجاثیہ ۴۵: ۲۳)

نفس کی خواہشیں ہزار ہوتی ہیں۔ ہر خواہش ایسی کہ اس پر دم نکلے، وہ محبوب و معبود بن جائے۔ ان سب کا نام دنیا ہے۔ ہوائے نفس کو الٰہ بنانے کے معنی بھی یہ ہیں کہ انسان دنیا کی ہر مطلوب شے کے بندے بن جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر وہی مقصود بن جاتی ہے، اسی کی طلب ہوتی ہے، اسی کے لیے سعی و جہد ہوتی ہے۔ قرآن مجید شدت سے اور کثرت سے دنیا پرستی سے روکتا ہے، دنیا کو برتنے سے نہیں۔ دنیا طلبی کو تمام گناہوں کا، ارادوں کی کمزوریوں کا، ایمان کے نقائص کا، کردار کی خامیوں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔

علمِ صحیح کی بہتات کے باوجود اس کے بے اثر ہو جانے کی وجہ بھی دنیا پرستی ہے (الاعراف ۷: ۱۷۶)۔ عمل سے انحراف بھی اتباعِ ھویٰ کا نتیجہ ہے (النسا ۴: ۱۳۵) سارے فساد و قتال کی جڑ بھی اپنے حق سے بڑھ کر لینا، دوسروں کا حق مارنے اور ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے کی دھن ہے (البقرہ ۲: ۲۱۳، آل عمران ۳: ۱۹، الشوریٰ ۴۲: ۱۴، الجاثیہ ۴۵: ۱۷)

دنیا کی پرستش ممکن نہیں جب تک آدمی اللہ سے ملاقات سے غافل نہ ہو، اس کے لیے تیاری

کی فکر سے فارغ نہ ہو جائے۔ اس لیے دنیا پرستی سے، اور ان اعمال سے جو دنیا پرستی کا نتیجہ ہیں، روکنے کے لیے قرآن ہر جگہ اللہ سے ملاقات کو دل پر نقش کرتا ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی، (النزعت ۷۹: ۴۰) ترجمہ: اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہو گی۔ اس سے مختصر اور جامع نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

برائی بھی، نیکی کی طرح، ایک درخت کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بڑی برائی سے شاخ در شاخ بے شمار برائیوں کا ایک شجرہ بن جاتا ہے۔ ہوا و ہوس اور دنیا کی بندگی سے وہ دوسرے بڑے امراض پیدا ہوتے ہیں جو قومی زندگی میں زہر گھول رہے ہیں، اور اصلاح کی کسی تدبیر کو کامیاب نہیں ہونے دے رہے، اور کبھی نہ ہونے دیں گے جب تک جڑ موجود باقی رہے گی۔

ہوائے نفس کی بندگی اور دنیا کی پرستش سے مال کی طلب اور ہوس پیدا ہوتی ہے۔ ہم اسے سینت سینت کر جمع کرتے ہیں۔ اسراف و تبذیر میں شیطان خرچ کرا لیتا ہے، شادیوں اور مکانوں پر لاکھوں اڑ جاتے ہیں، نیکی کے لیے ایک دھیلا بھی ایسی مشکل سے نکلتا ہے جیسے جان نکل رہی ہے۔ دنیا پرستی ہی سے جاہ و مرتبت اور قوت و عزت کی ہوس پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہم ہر جائز و ناجائز تدبیر اختیار کرتے ہیں۔ طاقت کا غلط استعمال کرتے ہیں، اکڑ فوں دکھاتے ہیں، انسانوں کی گردنوں پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہو جاتے ہیں۔ اپنا نفس، دل میں سب سے اعلیٰ مقام اسی کی وجہ سے حاصل کر لیتا ہے۔ دل تنگ ہوتے ہوتے ایک تاریک سوراخ کے برابر رہ جاتا ہے۔ شحِ نفس کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ خود غرضی چھا جاتی ہے۔ معاف کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ غصہ آتا ہے تو ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے، خون بہانے سے بھی نہیں رکتے۔

آپ خود دیکھ لیں۔ قوم و ملک کی حالت کا جو نقشہ آپ کے سامنے ہے، اس میں کون سی خرابی ہے جس کی جڑ ان بیماریوں میں نہیں۔ حقیر شخصی فوائد کے لیے اجتماعی و ملکی مفادات کو قربان کیا جا رہا ہے، دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹی جا رہی ہے، مزاج مسخ ہو گئے ہیں، رشوت کے بغیر کاغذ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا، ہر شخص کسی نہ کسی نوع کی قانون شکنی میں مشغول ہے۔ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے جا رہے ہیں، عدل و انصاف نایاب ہے، انسانی عزت پاؤں تلے پامال ہو رہی ہے ——— ان میں سے ہر خرابی ہوس پرستی اور دنیا پرستی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے یہ توقع رکھنا کہ اس بنیادی مرض کے علاج کے بغیر کسی بھی تدبیر سے مکمل شفا نصیب ہو جائے گی، ایک خام خیالی ہے۔

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی۔ اگر کوئی بت خدا بن کر دل میں بیٹھ گیا ہے، کسی کی

محبت دل میں گھر کر گئی ہے تو ہزار مذمت اور وعظ سے اس کو باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ اس کا تو ایک ہی علاج ہے۔ جو خدا لئے برحق ہے اسے دل میں وہی مقام حاصل ہو جائے جو اس کا حق ہے۔ اسی کی محبت' ہر محبت سے بڑھ کر' دل میں گھر کر لے۔ پھر ہر دوسری محبت سکڑ کر' اتر کر' اپنے صحیح مقام پر آ جائے گی۔

غور کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے اپنی قوم کی حالت بدل دی' اور اسے ساری دنیا کی حالت بدلنے کا ذریعہ بنایا۔ آپؐ نے اس مقصد کے لیے ان میں سے کوئی تدبیر بھی اختیار نہ کی جن کا آج بازار میں چلن ہے۔ آپؐ نے:

۱۔ دلوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ پر یقین و اعتماد' ان کی وفاداری اور ان کے ساتھ محبت سے بھر دیا۔ ان کی زندگیوں کا مرکز و محور اور ہدف و مقصد اللہ بن گیا۔ ان کی سمت اس کی طرف ہو گئی۔

۲۔ ان کو اللہ کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار' اس سے ملاقات کی تیاری کے لیے مضطرب و بے چین' اس کی آگ سے بچنے کے لیے فکرمند' اور اس کی جنت کے حصول کے لیے لالچی اور بے تاب بنا دیا۔

۳۔ دنیا بھر کو' قیامت تک' اللہ کی طرف بلانے' اللہ سے جوڑنے' اور اللہ کا بنانے کے لیے ان کو جدوجہد میں لگا دیا۔

بس یہ مختصر نسخہ تھا' جس سے ان کی اصلاح ہو گئی۔ پتھر کے بت ہی نہیں ٹوٹے' سینوں کے بت بھی پاش پاش ہو گئے۔ دنیا سے بڑی گہری دلچسپی رہی۔ وہ دنیا سے بے نیاز ہو گئے۔ ساری دنیا ان کی آخرت کی خاطر ضروری اور اہم ہو گئی۔ اس کا ہر لمحہ اور ہر حبہ آخرت کو کمانے کے لیے بیش قیمت ذریعہ بن گیا۔

یہ نہ سمجھیں کہ یہ نسخہ "پہلے فرد کی اصلاح' اس سے پہلے دل کی اصلاح اور اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا" کا نسخہ ہے۔ یہ تو اجتماعی اصلاح کا نسخہ ہے۔ ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں' جہاں دنیا پرستی اور ہوا و ہوس کی بندگی کا راج ہو' افراد کا سدھرنا اور اپنے سدھار پر قائم رہنا' تقریباً ناممکن ہے۔ چنانچہ خود ہمارے دور میں جو کوششیں' اجتماعی اصلاح کو نظرانداز کر کے' افراد کی اصلاح کے لیے' ان کا ایمان مضبوط کرنے کے لیے ہو رہی ہیں' ان کے اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ معاشرے اور نظام' افراد کے سدھر جانے سے' خود بخود نہیں سدھر جاتے۔ یہ تو ایک اجتماعی اصلاح کی مہم ہے' اور جو افراد اس نسخے کو قبول کرتے جائیں' ان کو اسی مہم سے منسلک کرنے کی مہم ہے۔

بس یہی وہ "تعلیم" ہے جس سے جہالت' علم نافع میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہی وہ "ترقی" ہے جس سے دلوں کا افلاس دولت مندی اور خوش حالی سے بدل جائے گا۔ یہی وہ "نظام" ہے جس

سے سارے احوال ٹھیک ہو جائیں گے - اسی سے جو خود غرض ، نفس پرست اور غیر ذمہ دار ہیں ، وہ بے غرض اور ذمہ دار بن جائیں گے - اسی سے ، جب ہدف اور سمت مل جائے گی ، تو وہ بے پناہ انسانی صلاحیتیں جو ضائع ہو رہی ہیں ، وہ کام میں لگ جائیں گی - اسی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان و زمین سے رزق کے دہانے کھول دے گا - اس کے لیے نہ درس گاہوں کے جال کی ضرورت ہے ، نہ اقتصادی منصوبوں کی بھرمار کی - اس کے لیے تو صرف ایمان و جہاد کی "درس گاہ" درکار ہے ، اور غلبہ دین کے "منصوبے" -

دل چاہتا ہے کہ ہمارے دینی و سیاسی عناصر ، ہمارے جنرل اور افسران ، ہمارے دانش ور اور صحافی ، آج جن لاحاصل تدابیر کے پیچھے رات دن لگے ہوئے ہیں ، وہ اپنی کم سے کم ۵۱ فی صد توجہات کا مرکز اس نسخہ اصلاح کو بنائیں اور اسے بروئے کار لانے کے لیے متفق و متحد اور کوشاں و رواں ہو جائیں -

لیکن ہم دوسروں کو وہ چیز نہیں دے سکتے جس سے خود ہماری جیبیں خالی ہوں - اس لیے قوم کو یہ نسخہ شفا پلانے کے ساتھ ساتھ ہمیں خود بھی اسے پینا ہو گا - اگر اللہ اور اس کے رسول کی باتوں اور وعدوں پر ہمارا یقین پختہ ہو تو ہمارے دل اس یقین سے بھر جانا چاہییں کہ صرف اسی نسخے کے استعمال سے ہمارا ملک مسلسل بحرانوں اور مسلسل بگاڑ اور زوال کے چکر سے نکل کر ترقی اور سربلندی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا -

---

"ترجمان القرآن" کے قیمتی صفحات کو اپنے ذاتی احوال کے ذکر کے لیے استعمال کرنا مجھے کبھی پسند نہ رہا ، لیکن اب ادارتی رفقائے کار کا اصرار ہے کہ میں قارئین کو باخبر کروں ، اس لیے کہ مولانا مودودی بھی حسب ضرورت ایسا کرتے تھے - ان کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے میں یہ چند سطور تحریر کر رہا ہوں -

۷ ماہ سے زائد ہو گئے ہیں ، ۱۹ جنوری سے میں اپنے عارضۂ قلب کے علاج کے لیے انگلستان (اسلامک فاؤنڈیشن ، مارک فیلڈ لیسٹر) میں مقیم ہوں - دسمبر ۹۵ میں ، لاہور میں ، میرا پرانا مرض قابو سے باہر (unstable) ہو گیا تھا - ڈاکٹروں نے پندرہ دن وہاں انتہائی نگہداشت میں رکھا ، اور پھر یہاں بھیج دیا ، اس لیے کہ میری اس بیماری کا ریکارڈ یہیں تھا - یہاں آتے ہی انجیو گرام ہوا ، جس سے یہ معلوم ہوا کہ دل کو خون فراہم کرنے والی تین بڑی شریانیں تقریباً مسدود ہیں ، اور کچھ اور بھی - یہ سراسر اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے فراہمی خون کے لیے دوسرے چھوٹے چھوٹے راستے کھول دیے ہیں - قدرت یہ انتظام ان سب کے لیے کرتی ہے جن کو ابھی زندہ رہنا ہوتا ہے -

میرا یہ مرض بہت پرانا ہے۔ ۱۹۶۶ میں ڈھاکے میں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس کے بعد چار اور ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۵ کے لگ بھگ سے انجائنا ہو گیا۔ ۱۹۸۱ کے ہارٹ اٹیک کے بعد، جب یہ معلوم ہوا کہ چار شریانیں بند ہیں، اور والو تو لیک کر ہی رہا تھا، تو ۱۹۸۲ میں لندن نیشنل ہارٹ ہسپتال میں پہلا آپریشن ہوا۔ اور والو کو درست کر دیا گیا۔ جب والو دوبارہ لیک کرنے لگا تو ۱۹۸۵ میں دوسرا آپریشن ہوا، اور پلاسٹک کا والو ڈالا گیا۔ ۱۹۹۱ میں مجھے پانچواں ہارٹ اٹیک ہوا، تو انجائنا دوبارہ شروع ہو گیا۔ ہر جگہ کے سب ڈاکٹر متفق تھے کہ جب تک ممکن ہو، تیسرے آپریشن سے اجتناب بہتر ہے اور دواؤں سے مداوا کیا جائے لیکن اب سب ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آپریشن کرا لینا چاہیے۔ ابھی صرف سپلائی متاثر ہے، لیکن دل ٹھیک کام کر رہا ہے، سائز ٹھیک ہے، والو ٹھیک ہے، اگرچہ انجائنا اسی طرح کثرت سے ہے جیسا لاہور میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ مشورہ قبول کر لیا ہے۔

نیشنل ہیلتھ میں آپریشنوں کے لیے ۶۔۱ ماہ کی ویٹنگ لسٹ ہے، لیکن سرجن نے کہا ہے کہ ترجیحی بنیادوں پر، مستقبل قریب میں وہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ کتنا قریب، یہ تو نہیں معلوم، لیکن میرا اندازہ ہے کہ ایک سے چار ماہ کے اندر۔

۳۰ سال اس مرض اور دوسرے حوادث کے ساتھ گزارنے کے بعد، مجھے یقین ہے کہ جتنی صحت اور مدت اللہ نے میرے لیے مقدر کی ہے، اس میں کوئی بھی ذرہ برابر کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ یہ بھی یقین ہے کہ اسی نے پیدا کیا، زندگی کی راہوں پر چلایا، وہی کھلاتا اور پلاتا ہے، اور وہی شفا دیتا ہے۔ اسی سے امید لگی ہوئی ہے کہ وہ قیامت کے دن خطاؤں کو معاف کرے گا۔ اس لیے اس سے یہی ہر وقت دعا ہے کہ جو صحت اور مدت بھی اب باقی ہے، وہ اس کے دین کی خدمت میں گزرے۔ اپنے بھائیوں کے لیے دعا، دعا کرنے والوں کے لیے اجر عظیم کا ذریعہ ہے، اور جس کے لیے دعا کی جائے اس کے لیے بھی نافع، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

تصاویر قرآنی

انسانی نفسیات اور کردار کی تصویریں

سید قطب شہید

قرآن مجید جس طرح اپنے بے مثل اسلوب تصویر کشی کے ذریعے مجرد معانی پر مشتمل مضامین کو مجسم اور محسوس شکل میں سامنے لاکھڑا کرتا ہے' اسی طرح وہ انسانی نفسیات کی کیفیات اور انسانی کردار کے نمونوں کی تصویر کشی کر کے ان کو بھی خیال و احساس کے لیے بے پناہ موثر کر دیتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

نفسیاتی کیفیات کی تصاویر

ا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جو شخص توحید کے بعد شرک کی زندگی اختیار کرے تو وہ کس قدر حیرت و تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا دل ایک خدا اور بہت سے خداؤں کے مابین تقسیم کر کے رکھ دیتا ہے' اس کے احساسات ہدایت و ضلالت میں بٹ جاتے ہیں۔ اس خیال کو وہ اس طرح محسوس اور متخیل تصویر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ ھَدٰنَا اللّٰہُ کَالَّذِی اسْتَھْوَتْہُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ لَہٗٓ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَہٗٓ اِلَی الْھُدَی ائْتِنَا۔ (الانعام ۶:۷۱)

اے نبیؐ' ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کرلیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو۔ دراں حالے کہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ یہ سیدھی راہ موجود ہے؟

اس آیت میں اس شخص کی تصویر کھینچی گئی ہے جس کو شیطان نے بھٹکا دیا ہو۔ استھوا کا صوتی آہنگ' اس کا تلفظ ہی ایسا ہے کہ اپنے مضمون کی تصویر پیش کرتا ہے۔ کاش! وہ شخص اسی بے راہ

روی پر قناعت کر لیتا تو اسے کم سے کم یکسوئی کی راحت تو حاصل ہو جاتی --- اگرچہ یہ راحت، گمراہی کی راہ اختیار کرنے کی قیمت پر حاصل ہوتی --- مگر افسوس کہ ایسا بھی نہیں ہوا۔ ایک دوسری جانب بھی ہے۔ وہاں سے اس کے چند احباب اسے ہدایت کی طرف بلا رہے ہیں اور اسے پکار رہے ہیں: "ہمارے پاس آؤ"۔ مگر وہ ہے کہ اپنی اس گم راہی اور ہدایت کی اس پکار کے درمیان حیران و سرگرداں کھڑا ہے، تذبذب کے عالم میں ہے، نہیں جانتا کہ فریقین میں سے کس کی دعوت پر لبیک کہے اور کس راہ پر گامزن ہو۔ وہ برابر کھڑا دونوں طرف جھانک رہا ہے، مگر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی حالت کھول دینا چاہتا ہے جن کے لیے وہ ہدایت و معرفت کی راہ آسان و ہموار کرتا ہے، مگر وہ اس سے اس طرح دور بھاگتے ہیں کہ گویا کوئی سہولت انھیں دی ہی نہیں گئی۔ پھر اسی تنزل کے گڑھے میں نیچے گرتے چلے جاتے ہیں۔ نفسانی خواہشات ان پر حملہ آور رہتی ہیں۔ ان کا علم اور ان کی جہالت دونوں ان کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں۔ نہ غفلت کی وجہ سے انھیں راحت نصیب ہوتی ہے اور نہ علم و معرفت کے باعث سکونِ قلب ملتا ہے۔ ان کی اس حالت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ، اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ
(الاعراف ۷:۵ ۱۷-۱۷۶)

اور اے نبیؐ، ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔

یہ تصویر اس شخص کی تحقیر و مذمت کی تصویر ہے۔ اس کا ایک دینی مقصد بھی ہے، جس سے ہمیں یہاں سروکار نہیں، مگر فنی اعتبار سے یہ بڑی نمایاں تصویر ہے۔ اس میں دائمی حرکت پائی جاتی ہے۔ ایک اس شخص کی تصویر ہے جس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کے ذریعے وہ اوپر چڑھ سکتا ہے، لیکن سب کچھ پھینک پھانک، وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے نیچے گرتا جا رہا ہے۔ ایک کتے کی تصویر ہے، جو اپنی خواہش اور لالچ کے پیچھے زبان لٹکائے پھر رہا ہے، کوئی بھی حالت درپیش ہو۔ یہ ایک عام تصویر ہے مگر جس معنی و مفہوم کا اظہار یہاں مقصود ہے وہ اس تصویر کی مدد سے بڑی شدت و قوت کے

ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں دینی غرض و غایت فنی غرض کے ساتھ یک رنگ و ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ قرآن کی کھینچی گئی جملہ تصاویر میں اسی قسم کا توافق و تطابق پایا جاتا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایک شخص کے عقیدہ میں تذبذب اور عدم استقلال کی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔ وہ یقین و اطمینان پر قرار نہیں پکڑتا۔ اس عقیدہ کی راہ میں جن شدائد و آلام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ ثبات و استقامت کے ساتھ ان کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے ایمان میں اتنی قوت نہیں کہ اپنے عقیدہ کو لذات زندگی سے الگ کر سکے ' مادی نفع و نقصان کو بالائے طاق رکھ سکے۔ اس عدم ثبات اور بے یقینی کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے جیسے اس کو قرار نہیں ' وہ ڈانواں ڈول ہے اور عین ممکن ہے کہ گڑھے میں گر جائے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ، فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ ، وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ، خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ، ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۔ (الحج ۲۲:۱۱)

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے ' اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔ پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ۔ یہ ہے گمراہی کی انتہا۔

قوتِ متخیلہ اس کنارے (حرف) کو مجسم کر کے نگاہِ تصور کے سامنے پیش کرتی ہے جس پر کھڑا ہو کر وہ شخص عبادت کرتا ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ وہ شخص صحیح طرح سے کھڑا ہونے پر قادر نہیں۔ وہ برابر لڑکھڑا رہا ہے۔ یہ تصویر اس شخص کے اضطراب اور عدم قرار کو آنکھوں کے سامنے اس طرح نقش کرتی ہے کہ الفاظ کے ذریعے اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس تصویر کے ذریعے اس شخص کی یہ حالت حواس میں منعکس ہو کر ذہن میں اتر جاتی ہے۔

بچپن میں جب پرائمری سکول کا طالب علم تھا تو تلاوت قرآن کے دوران جب میں اس آیت تک پہنچا تو میرے ذہن پر اس کی ایک تصویر مرتسم ہو گئی تھی ' جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ سادہ سی تصویر ابھی تک میرے ذہن پر منقوش ہے۔ اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔ اگر فرق پڑا ہے تو اتنا کہ مجھے اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ یہ ایک ضرب المثل ہے ' حقیقت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ قرآن کے اعجاز بیان کا کمال ہے کہ اس کے فہم و ادراک میں ادنیٰ و اعلیٰ ذہن رکھنے والے سب لوگ حصہ لیتے ہیں ' اور سب کے سامنے اس کی زندہ تصویر آ جاتی ہے ' خواہ ان کے فہم کے مدارج میں کتنا ہی اختلاف ہو۔

۴۔ اسلام لانے سے قبل جب مسلمان اپنی حالت کفر کی وجہ سے جہنم کے کنارے پر کھڑے تھے

تو ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ، وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ، وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (آل عمران ۳: ۱۰۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔

تصویر یوں ہے: تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہو۔ عین ممکن ہے کہ ذرا قدم پھسلے اور گڑھے میں جا گرو۔ یہاں تشبیہ کی عمدگی اور صداقت سے بحث اہم نہیں۔ یہاں جس چیز کی اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ چشم تصور کے سامنے حرکت، اضطراب اور گڑھے میں گرنے کی تصویر آتی ہے۔ اگر کوئی مصور اپنے رنگین برش کے ساتھ اس خیالی حرکت کو خاموش تصویر کے انداز میں پیش کر سکتا تو اسے اس کا بڑا کمال تصور کیا جاتا، حالانکہ مصور کے پاس تو برش، تختی، رنگ اور تصویر کشی کا سب سامان ہوتا ہے، مگر یہاں تو صرف الفاظ ہیں جن کے ذریعے قرآن نے یہ تصویر کھینچی ہے۔

ہم اس تصویر کے انداز تعبیر کی عمدگی کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ تصویر کھینچتے ہوئے پہلے آگ کا ایک گڑھا بنایا، پھر یہ دکھایا کہ مسلمان اسلام قبول کرنے سے پہلے اس گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ گویا یہ دنیوی زندگی، جو آگ اور ان کے درمیان حائل ہے، اس کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہے، اور اب کوئی چیز ان کے درمیان حائل نہیں۔ اب تصویر یوں مکمل ہوتی ہے کہ مسلمان --- جو ہنوز زندہ ہیں اور ابھی اسی دنیا میں ہیں --- اسلام قبول کرنے سے قبل آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہیں۔

۵۔ اس سے ملتی جلتی ایک تصویر اور ہے۔ یہ اس شخص کی تصویر ہے جو اپنے عمل کی بنیاد تقویٰ کے بجائے کسی اور بات پر رکھے۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ۔ (التوبہ ۹: ۱۰۹)

پھر تمھارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات نگر پر اٹھائی اور

وہ اسے لے کر جہنم کی آگ میں جاگری؟

جہنم میں گر جانے کی آخری حرکت جو اس آیت میں متوقع تھی یہاں اس کو آخری شکل دی گئی ہے۔ فرمایا "فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ (پھر وہ (عمارت) اسے لے کر جہنم کی آگ میں جاگری۔ یہاں دنیوی زندگی کو مکمل طور پر درمیان سے ہٹا دیا گیا ہے بغیر اس کے کہ یہ بات کہی جائے۔ گویا عملاً ایسا ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ "فَانْهَارَ" میں فاء کی جگہ ثم (پھر) کا لفظ لانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی، اس لیے کہ ثم تاخیر پر دلالت کرتا ہے۔ مگر یہاں تو جہنم میں گر جانے میں کوئی دیر نہیں۔ اور یہ دنیوی اور اخروی زندگی کے درمیان جو مدت ہے وہ طویل ہونے کے باوجود بے حد مختصر ہے۔ یہ بات عمدہ انداز میں پیش کرنے کا ایک طریقہ ہے کہ ہونے والے کام کو اس طرح ظاہر کیا جائے گویا وہ عملاً وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

انسانی کردار کی تصاویر

قرآن نفسیاتی حالات کے ساتھ ساتھ، انسانی کردار کے نمونوں کی تصویریں کھینچ کر بھی انھیں نگاہ تصور کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ ہم "مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ" پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں چند مزید مثالیں دیکھیے:

ا۔ مقصود یہ ہے کہ ایک ایسے احمقانہ اور اندھی جدل و نزاع کی تصویر کشی کی جائے، جس میں دلیل و برہان پیش کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس انسانی کردار کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۔ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ۔ (الحجر ۱۵: ۱۴۔۱۵)

اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (الانعام ۶: ۷)

اے پیغمبرؐ اگر ہم تمھارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھ چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

۲۔ اس امر کا بیان مقصد ہے کہ انسان اپنے رب کو اس وقت تو پہچانتا ہے جب تکلیف اور مشکل میں مبتلا ہو' مگر جب اچھے دن آتے ہیں تو اللہ بھول جاتا ہے جو مشکلات کا ازالہ کرنے والا ہے۔ مگر اس مفہوم کو وہ مجرد الفاظ میں بیان نہیں کرتا' بلکہ اس کی ایک تصویر کھینچتا ہے۔ یہ تصویر نئی نئی حرکات سے لبریز ہے' جس میں مشاہد و مناظر ایک کے بعد ایک آتے جاتے ہیں۔ اس تصویر کے اندر ایک ایسے انسانی نمونے کو پیش کیا جاتا ہے جو بنی نوع انسان میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَ تْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ - فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط (یونس ۱۰: ۲۲ - ۲۳)

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے' اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے"۔ مگر جب ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح تصویر میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ متحرک ہو جاتی ہے۔ کشتی موجوں کے اندر گھری ہوئی اور ڈگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے لوگ موجوں کے زیر اثر اوپر کو بلند ہوتے اور نیچے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اسی طرح ان کا ایمان اور نفسیاتی کیفیت بھی۔ آیت کے اختتام پر پہنچ کر طرز بیان اور بھی موثر ہو جاتا ہے اور یہ آیت اپنے معنی و مفہوم کو نہایت عمدہ طریقہ سے ادا کرتی ہے۔

۳۔ مقصود ایک ایسے شخص کا نمونہ پیش کرنا ہے' جس کا ظاہر بڑا دلفریب مگر باطن اسی قدر خطرناک اور ضرر رساں ہے۔ اس کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ - وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ - (البقرہ ۲: ۲۰۴-۲۰۵)

ترجمہ: انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمھیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا

ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

خیال میں متحرک تصویر، کردار کی صفات کو عمل اور تصرف میں تبدیل کر کے ظاہر کرتی ہے، اور ظاہر و باطن کے درمیان فرق و بعد کو بھی آشکار کر دیتی ہے۔

۴۔ بعض لوگ ایمان میں کمزور، اور عزم کے کچے ہوتے ہیں۔ ان کی اندرونی حالت پر پردہ پڑا ہوتا ہے اور ان کی کمزوریاں آسانی اور کشادگی کے وقت ظاہر نہیں ہوتیں۔ لیکن جب جدوجہد کا وقت آتا ہے اور آزمائشوں کا سامنا ہوتا ہے، تو یہ کمزوری پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ان کی نمایاں اور واضح تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (محمد ۴۷: ۲۰)

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے)۔ مگر جب ایک پختہ سورۃ نازل کر دی گئی، جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمھاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔

ایسے آدمی کی تصویر جس پر موت کی غشی طاری ہو، عام طور سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ جونہی اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ فوراً نگاہ تصور کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحقیر اور تمسخر کا تصور بھی آتا ہے۔

۵۔ بعض اوقات یہ انسانی کردار ایک واقعہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے مگر وہ اس خاص واقعہ سے تجاوز کر کے ایک عام اور دائمی کردار کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا، قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا، فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ، وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ۔ (البقرہ ۲: ۲۴۶)

پھر تم نے اس معاملے پر بھی غور کیا جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انھوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ

لڑو؟ وہ کہنے لگے: بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا، تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

یہ تصویر ایمان و عزم کی کمزوری پر مزید اضافہ کرتی ہے۔ جب امن و سکون کا زمانہ تھا تو بنی اسرائیل کی یہ استقامت اور اصرار، اور یہ اپنی جرات و بہادری کا مظاہرہ! ۔ جونہی جدال و قتال کا وقت آیا تو بزدلی دکھانے لگے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا واقعہ نہیں جو پیش آیا اور گزر گیا۔ بلکہ زمان و مکان کی قید سے آزاد یہ ایک کردار ہے جو بنی نوع انسان میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ (جاری) [ترتیب و تدوین: خرم مراد]

کلامِ نبویؐ کی صحبت میں

خرم مراد

حضرت عمربن الخطابؓ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا:

تم لوگ اگر اللہ پر اس طرح توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمھیں اس طرح رزق دے گا جس طرح چڑیوں کو رزق دیتا ہے: چڑیاں صبح سویرے گھونسلوں سے نکلتی ہیں تو وہ بھوکی اور خالی پیٹ ہوتی ہیں، مگر شام کو اپنے گھونسلوں میں واپس آتی ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔
(ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الصبر والتوکل، ابن ماجہ)

توکل کے معنی ہیں اللہ کو اپنا وکیل بنانا، یعنی اپنے معاملات اسی کے سپرد کر دینا، یقین رکھنا کہ جو کچھ وہ کرے گا وہی ہو گا، اسی پر بھروسہ رکھنا، اور پھر پوری طرح مطمئن رہنا۔

ہم وکیل اس کو بناتے ہیں جس کے بارے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ اسے ہمارے معاملے کا پورا علم ہے، اور اس پر پوری قدرت حاصل ہے، جو ہماری بھلائی اور بہتری کا خواہاں ہے، جو ہمارا معاملہ حل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ علیم وقدیر ہیں، رحمٰن ورحیم ہیں، ان سے بہتر وکیل کون ہو سکتا ہے: حسبنا اللہ، نعم المولیٰ ونعم الوکیل۔

توکل کی روح یہ نہیں کہ انسان اسباب اور تدابیر ترک کر دے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس کی نظر، یقین اور اعتماد، اسباب اور تدابیر پر نہ ہو کہ ان سے کچھ ہو سکتا ہے۔ نہیں، بلکہ اللہ پر ہو جو ربُّ الاَسباب ہے، اور مدبر حقیقی ہے۔ امام غزالی کے الفاظ میں ''توکل ترکِ اسباب کا نہیں، ترکِ رویت اسباب کا نام ہے''۔

کتنی بدنصیبی اور حماقت ہے کہ رب پر ایمان اور توکل کا دعویٰ ہو، اور روز، رزق کے اندیشوں اور تمناؤں میں ہزار بار جان نکلے: ''کل'' کیا کھائیں گے، سر پر سایہ ہو گا یا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کیا اللہ کے اس وعدے پر یقین نہیں کہ وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (زمین پر چلنے والا کوئی نہیں جس کو رزق پہنچانا اللہ کے ذمہ نہ ہو)؟

یہ ''کل'' بھی دنیا کے تو برسوں اور نسلوں پر محیط ہوتی ہے، مگر آخرت اس میں شامل نہیں ہوتی۔ اس ''کل'' کے اندیشے سے آدمی اپنے مال کو بنک اور تجوری میں سینت سینت کر رکھتا ہے، لیکن اپنی

آخرت میں آگے کچھ جمع نہیں کرتا۔ دنیا میں ان برسوں کا انتظام کرنے کی کوششوں میں خون پسینہ ایک کرتا ہے جن کا شاید ایک لمحہ ہی باقی رہ گیا ہو۔

پرندوں کو دیکھو: گھر میں آج کے کھانے کا سامان بھی نہیں ہوتا۔ نہ بنک بیلنس نہ ذریعہ معاش۔ صبح، بھوکے رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں، شام کو واپس لوٹتے ہیں تو پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ یہ معجزہ روز ظہور پذیر ہوتا ہے، لیکن دل اندیشوں، دنیا طلبیوں اور ذخیرہ اندوزیوں کی وادی میں بھٹکتا رہتا ہے۔

○

حضرت ابو سعید بن المعلی کہتے ہیں:

میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا۔ میں نے آپؐ کو جواب نہ دیا، اور (نماز ختم کر کے) آپؐ کے پاس آیا، اور عرض کیا: یارسول اللہ، میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ "اللہ کی بات پر لبیک کہو، اور اس کے رسولؐ کو جواب دو جب وہ تمھیں بلائیں" (الانفال ۸: ۲۴)

پھر حضورؐ نے فرمایا کیا میں تم کو، مسجد سے باہر نکلنے سے پیش تر، قرآن کی سب سے عظیم سورۃ نہ سکھاؤں؟ پھر حضورؐ نے میرا ہاتھ پکڑا، اور جب ہم مسجد سے نکلنے لگے، تو میں نے آپؐ کو یاد دلایا: یا رسول اللہؐ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں تمھیں قرآن کی سب سے عظیم سورۃ سکھاؤں گا۔

حضورؐ نے فرمایا: وہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ یہی سبع مثانی (سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے (بخاری، بحوالہ مشکوٰۃ، باب فضائل القرآن)

حضرت عبدالملک بن عمیرؓ سے مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۃ الفاتحہ میں ہر بیماری کی شفا ہے۔ (دارمی، بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ ایضاً)

سورہ فاتحہ قرآن کی ساری تعلیمات کی بنیاد، جڑ اور خلاصہ ہے۔ یہ امراضِ قلبی کا اور امراضِ اجتماعی کا علاج تو یقیناً ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ امراض جسمانی میں بھی اس سے شفا ہوتی ہے۔

○

حضرت ابی بن کعبؓ بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابومنذر، کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے پاس جو آیات قرآنی ہیں، ان میں سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ حضورؐ نے دوبارہ پوچھا: اے ابو منذر، کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے پاس قرآن کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟

میں نے عرض کیا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ۟ ... (آیت الکرسی)
(کہتے ہیں) حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے میرا سینہ تھپتھپایا اور فرمایا: اے ابومنذر، یہ علم تمھیں برکت، مسرت اور خیر عطا کرے گا۔ (مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ، ایضاً)

حضرت علیؓ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منبر پر کھڑے یہ کہتے سنا ہے: جو شخص ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا، اس کے جنت میں داخل ہونے میں صرف مرنے کے دیر ہے۔ جو اس کو بستر پر لیٹنے کے بعد پڑھا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے گھر کو، اس کے پڑوسی کے گھر کو اور اس کے پڑوس کے گھروں کو امن و حفاظت میں رکھے گا۔ (بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ باب الذکر بعد الصلوٰۃ)

آیت الکرسی معرفت الٰہی کا وہ خزانہ ہے جو تعلق باللہ، اخلاص، اور توکل کی دولت بخشتا ہے، اور جس سے ایمان کے تقاضے پورے کرنے، شرائع و اخلاق پر عمل کرنے اور جہاد کے لیے جان و مال لگانے کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کو بار بار پڑھنے پر یہ بشارتیں ہیں۔

○

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص رات کو سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں پڑھا کرے گا، یہ اس کے لیے ہر طرح کافی ہوں گی (بخاری، مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ، ایضاً)

حضرت جبیر بن نفیرؓ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کو دو آیتوں پر ختم کیا ہے۔ یہ آیتیں مجھے [رحمت کے] ان خزانوں میں سے دی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہیں۔ ان کو سیکھو، اپنی عورتوں کو سکھاؤ۔ یہ دو آیتیں، رحمت ہیں، قربت کا ذریعہ ہیں، بہترین دعا ہیں۔ (دارمی، مرسلاً، بحوالہ مشکوٰۃ ایضاً)

ایک دوسری روایت میں حضرت ایفع بن عبدالکلاعیؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: دنیا اور آخرت کی بھلائیوں میں سے کوئی بھلائی ایسی نہیں جو چھوٹ گئی ہو اور ان آیتوں میں شامل نہ ہو۔ (دارمی، بحوالہ مشکوٰۃ، ایضاً)

ان آیات میں بھی قوت و استعداد کے وہ بیش بہا خزانے ہیں جن کے ذریعے دین کی راہ پر چلنا ممکن اور آسان ہوتا ہے۔

○

حضرت فروہ بن نوفلؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ، مجھے ایسی آیات سکھایئے کہ میں جب سونے کے لیے بستر پر لیٹوں تو انھیں پڑھا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا:

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ، یہ شرک سے بری اور پاک کرتی ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ، ایضاً)

حضرت ابوالدرداءؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں کوئی ایک رات میں ایک تہائی قرآن نہیں پڑھ سکتا؟ صحابہؓ نے عرض کیا: ایک تہائی قرآن کس طرح پڑھیں۔

حضورؐ نے فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَد ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ (مسلم، بخاری، بحوالہ مشکوٰۃ، ایضاً)

حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم کو کچھ پتا ہے کہ آج کی رات جو آیات اتاری گئی ہیں، ان کی طرح کی آیات کبھی نہیں دیکھی گئیں: قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ، ایضاً)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

ہر رات، جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر لیٹتے، آپؐ اپنے دونوں ہاتھ ملاتے، پھر قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَد، قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے، پھر دونوں ہاتھوں میں پھونکتے، ان ہاتھوں کو اپنے جسم مبارک پر جہاں تک ہو سکتا، پھیرتے، سر اور چہرے، اور جسم کے سامنے سے شروع کرتے۔ تین دفعہ ایسا کرتے۔ (بخاری، مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ، ایضاً)

○

حضرت ابوسعیدؓ اور جابرؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

غیبت زنا سے زیادہ سخت اور بڑا گناہ ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا: غیبت، زنا سے زیادہ سخت گناہ کیوں کر ہے؟

حضورؐ نے فرمایا: آدمی زنا کرتا ہے، پھر توبہ کر لیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور زنا کا گناہ معاف کر دیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کو معاف نہیں کیا جائے گا، جب تک وہ شخص اس کو معاف نہ کرے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔ (بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب حفظ اللسان و الغیبة و الشتم)

کم لوگ ہیں جو غیبت سے پاک ہوں۔ انسان کے گوشت سے زیادہ لذیذ کوئی گوشت نہیں۔ ہر لقمہ کے لیے نفس کے پاس کوئی تاویل اور جواز ہوتا ہے۔ لیکن غیبت کرنے والے کی عزت و احترام اور معاشرہ

میں اس کے مقام میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اندازہ کیجیے کہ غیبت اس گناہ سے بھی شدید تر اور بڑا گناہ ہے، جس کا تصور بھی ایک عام شریف آدمی نہیں کر سکتا۔

غیبت سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے: کہیں بھی، کسی سے بھی، کسی کا بھی ذکر ہی نہ کرو، الا یہ کہ اس کی بھلائی کا ذکر ہو۔

غیبت ہو جائے تو معافی و تلافی ضروری ہے۔ معافی مانگنے سے فساد اور فتنہ بڑھتا ہو، تو آدمی اس کی کوئی خدمت کر دے، اس کا دفاع کرے، اس کی اچھائی بیان کرے، اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کرے جس کی غیبت کی ہو۔ پھر اللہ سے عفو و مغفرت کا امید وار رہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کے مطابق'

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مومن کے ایمان کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ خیر سے کبھی سیر نہ ہو' اسی کی طلب اور پیاس آخری سانس تک قائم رہے۔

جیسے انسان کا جسم آخری سانس تک غذا اور پانی طلب کرتا ہے اور یہی اس کی حیات' پرورش اور تقویت کا سبب ہوتا ہے' اسی طرح مومن کا نفس خیر سے پرورش پاتا اور تقویت حاصل کرتا ہے۔ یہی اس کی غذا ہے

وہ خیر کا علم حاصل کرنے' اور خیر پر عمل کرنے کی اور خیر کی طرف بلانے کے کسی موقع کو ضائع نہیں کرتا۔

وہ طالب خیر' معلم خیر اور داعی الی الخیر ہوتا ہے۔

وہ خیر میں ہی لطف محسوس کرتا ہے

جس کا دل نیکی کی باتوں میں اور نیکی کے کاموں میں نہ لگے' اسے اپنے ایمان کی فکر کرنا چاہیے۔

(خیر خواہ)

مذاکرہ

بنک کے سود کا مصرف

اسلامی تہذیب کی تشکیل نو کے لیے فقہ اسلامی کی تشکیل نو ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال نے سید مودودی کو اسی مقصد کے لیے دارالاسلام منتقل ہونے کی دعوت دی تھی۔ خصوصاً عصر حاضر میں 'نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ تمدن میں 'سیاست میں 'اقتصادیات میں 'سیاسی معیشت میں 'معاشرہ میں 'خاندان میں 'طب میں 'غرض زندگی کے ہر دائرے میں۔ بہت سے قدیم مسائل کی بھی ماہیت اور صورت بالکل بدل چکی ہے۔ مسئلہ نہیں بدلا ہے 'تو حالات و زمانہ یکسر بدل گئے ہیں۔ ان حالات میں فقہ اسلامی کی تشکیل نو کو ملت کے ایجنڈے پر سرفہرست ہونا چاہیے۔

یہ کام کرنے کے لیے 'سلف کی طرح 'مجتہدین مطلق نہ موجود ہیں نہ پیدا ہوتے نظر آرہے ہیں۔ اجتہاد کی ضرورت جتنی شدید ہے 'اجتہاد صحیح کی صلاحیت اتنی ہی قلیل ہے۔ بہرحال اہل علم جیسے کچھ بھی ہیں 'ان کا فرض ہے کہ غور و فکر کریں 'باہم سر جوڑ کر بیٹھیں 'اظہار رائے کریں 'حل تلاش کریں 'حل پر متفق نہ ہو سکیں تو کم سے کم اختلاف کرنے کے حق پر اتفاق کو ضائع نہ کریں 'تحمل اور رواداری اختیار کریں 'تکفیر نہ کریں 'لیبل نہ چسپاں کریں 'ہر اختلاف کرنے والے کا احترام کریں۔ یہی سلف کا طریقہ تھا 'یہی خلف کا ہونا چاہیے۔

خوشی کی بات ہے کہ بھارت میں 'ہر مکتب فکر کے علما تقریباً آٹھ سال سے مختلف مسائل پر فقہی سیمی نار منعقد کر رہے ہیں 'مقالات پیش کر رہے ہیں 'بحث مباحثہ کر رہے ہیں 'اور اختلاف و اتفاق کے نکات پر متفقہ اعلامیے جاری کر رہے ہیں۔ یہ مقالات و مباحث شائع بھی ہو رہے ہیں اور اب تک اسلامک فقہ اکیڈمی (بھارت) 'دہلی 'پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۵ 'نئی دہلی ۲۵ سے سات مجلات شائع ہو چکے ہیں۔

ہم اس سے پہلے "اعضا کی پیوند کاری" کے مسئلہ پر 'ان مقالات سے مرتب کردہ ایک مذاکرہ پیش کر چکے ہیں (ترجمان القرآن 'مارچ ۱۹۹۵)۔ اب انھی مقالات سے مرتب کردہ 'دوسرا مذاکرہ "بنک کے سود کا مصرف" پیش کیا جارہا ہے۔

مسئلہ زیر بحث بھی عملی طور پر ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایک طرف سود کے بارے میں شدید وعید قرآنی ہے 'اعلان محاربہ ہے۔ دوسری طرف آج کی معیشت سود کے شکنجے میں کسی ہوئی ہے اور شاید کسی کو بھی بنک

کے استعمال سے مفر نہیں۔ جن مفروضات پر اب تک فتاویٰ دیے جاتے رہے ہیں، ان میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ اب بنک میں چھوڑے ہوئے سود کا مصرف لازماً اسلام کے خلاف ہونا ضروری نہیں، اس لیے کہ یہ نظام خود مسلمان چلا رہے ہیں۔ اسلامک ڈویلپمنٹ بنک کے پاس سود کی بڑی رقم ہوتی ہے جو وہ اپنی دانست میں کار خیر میں خرچ کرنا چاہتا ہے۔ پھر کرنٹ اکاؤنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کی بحث بھی نظری رہ گئی ہے۔ جو پیسہ بنک کے پاس ہوتا ہے، کسی بھی اکاؤنٹ میں ہو، اس سے وہ "نفع" کماتا ہے۔ کرنٹ اکاؤنٹ کی صورت میں تعاون عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَان زیادہ شدید ہوتا ہے--- خواہ رقم جمع کرانے والا قانوناً سود کے کاروبار سے بچ جائے۔ اس لیے کہ یہ "نفع" سب بنک کے پاس رہتا ہے۔ اور اب اکثر ممالک میں کرنٹ اکاؤنٹ پر بھی سود دیا جانے لگا ہے اس لیے کہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ صریح ناانصافی ہے کہ بنک کرنٹ اکاؤنٹ والے کا پیسہ استعمال کرے اور اسے کچھ نہ دے۔ سیونگ اکاؤنٹ کی صورت میں کم سے کم بینک کے ساتھ تعاون اور اس کی تقویت کچھ کم ہو جاتی ہے۔

بہرحال ہمارے پیش نظر ان مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل پیش کرنا نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا۔ بعض قارئین کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کے سامنے صرف ایک حل لایا جائے جس کو ترجمان یقینی اور قطعی صحیح حل کے طور پر پیش کرے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اول تو اجتہادی مسائل میں اختلاف، بلکہ متضاد فتاویٰ سے کوئی مفر نہیں۔ یہ اختلاف، اجتہاد کا فطری تقاضا ہے۔ یہ عہد صحابہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ دوسرے، ترجمان کی حیثیت نہ مجتہد کی، نہ قاضی کی۔ یہی مسلک صاحب ترجمان رحمت اللہ علیہ کا تھا اور وہ اسی پر کاربند تھے۔ ہاں ان کا یہ مقام تھا کہ وہ اپنی رائے بھی ظاہر کر دیں۔ یہ ہمارا مقام نہیں۔ لیکن اپنی رائے کو ناطق رائے کا مقام دینے سے وہ بھی اجتناب کرتے تھے۔ تیسرے، یہ بھی ان کا مسلک ہے، اور ہم اس پر کاربند رہنا چاہتے ہیں، کہ اختلاف ہو تو ساری آرا کو بیان کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے تفہیم القرآن اور رسائل و مسائل کا پڑھ لینا کافی ہو گا۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ بحث و نظر کی راہ کھلے، یہ ادراک و شعور پیدا ہو کہ اختلاف ہوا کرتا ہے، شدید بھی ہوا کرتا ہے، متضاد آرا تک بھی مجتہدین پہنچ سکتے ہیں، سلف بھی پہنچے ہیں، اور خلف بھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ قارئین یہ بھی دیکھیں اور سیکھیں کہ علما کس طرح اجتہاد و استدلال کرتے ہیں، کس طرح بحث مباحثہ کرتے ہیں، اس طریق میں کیا خوبیاں ہیں اور کیا خرابیاں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح مسائل کا شعور و ادراک بڑھے، رواداری و تحمل پیدا ہو، وسعت ظرف میں اضافہ ہو، اختلاف کی بنیاد پر فوراً تجدد پسندی، مغرب زدگی، گمراہی اور کفر و فسق کے لیبل اور فتاویٰ چسپاں کرنے کی روش ختم ہو۔

امید ہے قارئین اس مذاکرہ کو اسی حیثیت سے پڑھیں گے اور دلچسپ و مفید پائیں گے۔ (مدیر)

۱۔ مفتی نظام الدین، دیوبند

جو بینک غیر سرکاری ہوں، اس میں جمع کردہ روپے پر جو رقم سود کے نام سے ملے اس کو وہاں سے نکال کر، اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے، مسلم غربا و مساکین کو جو مستحق زکوٰۃ ہوں، بطور صدقہ

دے دے ' خود اپنے کسی کام میں نہ لائے ' اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے ۔

اور جو بنک سرکاری ہوں ' ان بنکوں سے جمع شدہ رقم پر جو پیسہ سود کے نام سے ملے اس کو بھی بنک میں نہ چھوڑے ' بلکہ وہاں سے نکال کر دیکھے: اگر اپنے اوپر گورنمنٹ کا کوئی غیر شرعی ٹیکس لاگو ہو رہا ہو تو وہ رقم پہلے اس میں دے تاکہ مال اپنے مالک کے پاس لوٹ جائے ۔ پھر جو رقم بچے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غربا و مساکین کو جو مستحق زکوٰۃ ہوں ' بطور صدقہ دے کر اپنی ملکیت سے نکال دے ' اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے ' کیونکہ ایسے مال کے صدقہ کرنے میں ثواب کی نیت کرنے کو محققین فقہا کفر تک فرماتے ہیں ۔

اس حکم کے دلائل کے لیے ' حرام مال کے بارے میں جو احکام کتب فقہ میں اور بذل المجھود جلد ۱ ' ص ۳۷ میں مذکور ہیں ' وہ کافی ہیں اور مزید تحقیق و تفصیل مطلوب ہو تو اعلاء السنن جلد ۱۴ ملاحظہ کی جاسکتی ہے ۔

۲ ۔ جناب شمس پیرزادہ ' بمبئی

بنکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا لینا جائز نہیں ہے کیونکہ سود ' سود ہے ' اور اس کا لینا خواہ وہ کسی غرض سے ہو ' جائز نہیں ۔ بنک میں رقوم جمع کرنے کے لیے دو قسم کے کھاتے کھولے جاتے ہیں ' ایک کرنٹ اکاؤنٹ ' دوسرا سیونگ اکاؤنٹ ۔ کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک کوئی سود نہیں دیتا اس لیے اسی کو ترجیح دی جانی چاہیے ۔ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک سود دیتا ہے ۔ یہ سود اگر بنک ہی کو چھوڑ دینا ممکن ہو تو یہی صورت اختیار کی جانی چاہیے ' کیونکہ سود کھاتے دار کی اپنی رقم نہیں ہے ' وہ صرف راس المال لینے کا حق دار ہے ۔ لہٰذا اس بات کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ بنک اس سود کی رقم کو کس مصرف میں لاتا ہے لیکن اگر سود وصول کرنا ہی پڑا تو پھر اس کا مصرف وہی ہے جو صدقہ کا مصرف ہے ' یعنی فقرا کی اعانت ۔

سرکاری بنکوں اور غیر سرکاری بنکوں سے سود لینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ اگر سرکاری بنکوں کے سود کو جائز قرار دیا جائے تو سرکاری لاٹری کو بھی جائز قرار دینا پڑے گا ۔ اس سلسلے میں یہ دلیل کوئی دلیل نہیں کہ حکومت عوام کی ہے اس لیے سرکاری بنک زر اصل پر جو کچھ زائد رقم دیں وہ سود نہیں ہے ' بلکہ ایک قسم کا عطیہ ہے ۔ اسلام میں مال دینے کا طریقہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اگر مال پاکیزہ طریقہ سے دیا جائے تو وہ جائز بھی ہے اور اس کے اخلاقی اثرات بھی اچھے ہوتے ہیں ۔ اگر وہی مال ناپاک طریقہ سے دیا جائے تو ناجائز بھی ہوتا ہے اور اس کے اخلاقی اثرات بھی برے مرتب ہوتے ہیں ۔ سود کے طور پر دی جانے والی رقم بہرحال جائز نہیں ہو سکتی ' خواہ باپ بیٹے کو دے ' شوہر بیوی کو دے یا حکومت اپنے شہریوں کو دے ۔

۳۔ **مولانا خالد سیف اللہ رحمانی**' حیدر آباد

سود کا بنک میں چھوڑنا ایک سودی کاروبار میں مزید تعاون ہے۔اور غالباً ایسی رقوم کا استعمال کبھی ایسی مدات میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ کفر کو تقویت پہنچتی ہے' اس لیے بطریق "استحسان" اس کا نکال لینا واجب ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری بنک دونوں کا حکم مساوی ہے۔کیونکہ سود یا "افراد" سے وصول کیا جاتا ہے یا پوری قوم سے۔گو وہ خود بھی قوم کا ایک فرد ہے' لیکن پوری قوم کے مقابلے میں اس کا "وجود" اتنی قلیل نسبت رکھتا ہے کہ یہ دوسروں ہی سے سود حاصل کرنے کے حکم میں ہے۔اس سلسلہ میں حد سرقہ وغیرہ کے بعض احکام سے' جن میں بیت المال کی چوری پر حد سرقہ کا نفاذ عمل میں نہیں آتا' غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ "حدود" معمولی شبہات کی وجہ سے معاف کر دی جاتی ہیں' جب کہ ربا کا معمولی شبہ "دعو الربا و الريبة" کے تحت اس کو حرام کر دیتا ہے۔

بعض بزرگوں نے اس رقم کا مصرف فقرا و مساکین کو قرار دیا ہے۔اس کی دلیل میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مال حرام جسے اس کے مالک تک پہنچانا ممکن نہ ہو' فقہا نے اسے واجب التصدق قرار دیا ہے جیسا کہ عالمگیری اور شامی وغیرہ کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ قتال اور جنگ کے علاوہ جو مال بیت المال کو حاصل ہو' وہ مسلمانوں کے مصالح عامہ پر خرچ کیا جائے گا' جیسے سرحدوں اور قلعوں کی تعمیر اور قاضی وغیرہ کی تنخواہ (ہدایہ ۲' ص ۶۰۰) صاحب درمختار نے بیت المال کی حاصل ہونے والی آمدنی اور اس کے مصارف کے سلسلہ میں محمد بن شحنہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ وغیرہ کو تمام مصالح مسلمین میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔علامہ شامی نے لکھا ہے کہ یہی رائے امام فخر الاسلام بزدوی کی ہے کہ یہ آمدنی مساجد' سرحدات' مسافر خانے اور پلوں کی تعمیر میں بھی صرف کی جا سکتی ہے۔(رد المختار ۲' ص ۵۸) صاحب درمختار کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔عالمگیری کی عبارت میں لقطہ کی آمدنی کو تکفین میت میں استعمال کی اجازت دی گئی ہے' اور اسے طحاوی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ اور اس طرح کی دوسری آمدنی جس کا کوئی مالک موجود نہ ہو' ایسی مدات میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے' جس میں تملیک نہ پائی جاتی ہو۔شامی نے بزدوی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے' اور زیلعی اور صاحب ہدایہ کی نقل کو ترجیح دی ہے کہ یہ رقم فقرا پر خرچ کی جائے گی۔لیکن زیلعی سے جو مصارف نقل کیے گئے ہیں' ان میں تکفین میت بھی ہے اور یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ میت کی تجہیز و تکفین فقہا کے نزدیک تملیک کا حکم نہیں رکھتی۔اسی طرح علامہ سرخسی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام لقطہ سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مضاربت کے لیے

دے سکتا ہے، اور قرض پر لگا سکتا ہے۔

ان نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بنک انٹرسٹ کو عام رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مال لقطہ وغیرہ کو بعض فقہا نے فقرا پر صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن وہ اس اصل پر مبنی ہے کہ صدقہ کرنے کا مقصود اصل مالک سامان کو ثواب پہنچانا ہے۔ جب کہ بنک انٹرسٹ کے خرچ کرنے کا مقصد محض مال حرام کو اپنی ملکیت سے نکالنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "لاصدقة فی غلول" کے تحت اس مال میں صدقہ اور ثواب کی نیت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ جلال الدین سیوطی نے بھی ایسے مال کا، جس کا مالک معلوم نہ ہو، مصرف مسلمانوں کی عام مصالح قرار دیا ہے۔ اسی لیے میری رائے ہے کہ بنک انٹرسٹ تمام رفاہی کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے، البتہ مساجد کی تعمیر میں اس کا استعمال مساجد کی حرمت و عظمت کے خلاف ہے، اس لیے اس سے منع کیا جائے گا۔

۴۔ مفتی حبیب اللہ قاسمی، جون پور

اگر گھر میں حفاظت کی کوئی شکل ہو تو بنک میں روپیہ رکھنا ہی نہیں چاہیے۔ بدرجہ مجبوری رکھنے کی اجازت ہے، اس لیے کہ بنک کا سارا نظام سودی ہے اور جتنا روپیہ دیا جاتا ہے وہ سب اس نظام کے تحت استعمال کیا جاتا ہے، اور یہ نص قطعی ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ روپیہ بنک میں رکھنے کی صورت میں تعاون علی الاثم لازم آئے گا جو ممنوع ہے۔ اسی وجہ سے حضرت گنگوہی و حضرت تھانوی نے اپنے فتاویٰ میں بنک میں روپیہ جمع کرنے کو نادرست قرار دیا ہے۔ لیکن گھر میں غیر محفوظ ہونے کے خطرہ کے پیش نظر، "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس صورت میں بھی کوشش اس کی ہو کہ لاکر لے کر اس میں رکھ دیا جائے، یا پھر کرنٹ اکاؤنٹ کھول کر اس میں جمع کر دیا جائے۔ لیکن اگر یہ دونوں صورتیں نہیں اپنائی گئیں، بلکہ چالو کھاتہ کھلوا کر رقم جمع کی ہے، پھر اس پر جو سود ملے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے، خواہ سرکاری ادارہ ہو یا غیر سرکاری۔ اس لیے کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اسے استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی تعاون عَلَی الْاِثْمِ کے دائرہ میں داخل ہے۔ اگر اس سے وہ اپنی عبادت گاہ نہ بھی بنائیں تو یقیناً وہ پیسہ کسی دوسرے راستے سے اسلام دشمنی پر خرچ ہو گا یا اس سے اپنی پوزیشن وہ مضبوط کریں گے جو نتیجہ کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا اس لیے "اذا ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما" ضابطہ کے اھون یہی ہے کہ اسے لے لے بنک میں نہ چھوڑے۔

اب دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کہاں صرف کیا جائے؟ اس کے مصارف کی تعیین سے قبل یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ اس مال کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے سود ہونے کی وجہ سے مال حرام ہونا

تو متعین ہے' اور مال حرام کا صدقہ کرنا واجب ہے (ھدایہ)۔ لہٰذا سود کا واجب التصدق ہونا متعین ہو گیا۔ اب اس کے مصارف تین ہیں: (۱) فقرا کو دینا (۲) غیر واجبی ٹیکس اس سے ادا کرنا۔ (۳) رفاہ عام' کنواں' نل' بیت الخلا وغیرہ میں لگانا۔

ان مصارف ثلاثہ میں سے مصرف اول یعنی فقرا کو دینا تو متفق علیہ ہے۔ اس میں اکابر و اصاغر کا کوئی اختلاف نہیں۔ چنانچہ علامہ علاوالدین حصکفی فرماتے ہیں: "مالک کا علم نہ ہو' تو فقرا ہی مصرف ہیں" (درالمختار' ج ۳' ص ۲۲۳)۔ لیکن فقرا کو دینا بھی بلاشرط نہیں' بلکہ مشروط ہے۔ اب ان شرائط کو عرض کرتا ہوں۔

۱۔ فقرا مسلمین ہوں غیر مسلمین نہ ہوں۔ اس لیے کہ جب اس کا واجب التصدق ہونا متعین ہو گیا تو واجب التصدق اموال جیسے زکوٰۃ' صدقۃ الفطر وغیرہ جس طرح غیر مسلم کو دینا جائز نہیں اسی طرح سود بھی غیر مسلم کو دینا جائز نہیں۔

۲۔ بلانیت ثواب دیا جائے۔ اس لیے کہ مال حرام بہ نیت صدقہ دینا بہت خطرناک ہے۔ چنانچہ ابن عابدین شامی نے رد المحتار میں' اور اسی طرح ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تصریح کی ہے کہ ایسا کرنا کفر ہے۔ ہاں' البتہ تعمیل حکم پر ثواب ملے گا' لیکن صدقہ کرنے والا تو صرف فراغ ذمہ و سبکدوشی کی نیت سے دے دے۔ (معارف السنن، ج ۱' ص ۳۴)

مصرف ثانی غیر واجبی ٹیکس میں سود کی رقم کو دینا ہے۔ اس ملک میں بہت سے ٹیکس غیر واجبی ہیں' ان میں سود کی رقم دی جاسکتی ہے۔ اب تک ناکارہ کے علم میں اس مصرف کے بارے میں بھی کسی کا اختلاف نہیں۔ غیر واجبی ٹیکس میں دینے کی اجازت یہاں سے ملتی ہے کہ مال حرام کا مالک اگر معلوم نہ ہو اور نہ معلوم کرنا ممکن ہو تب فقرا پر تصدق واجب ہے۔ اگر معلوم ہو تو مالک کو پہنچانا ضروری ہے' اگر مالک زندہ نہ ہو تو اس کے ورثا کو دے دے۔ (درالمختار' ج ۴' ص ۲۸۳)

اس اعتبار سے مالک معلوم ہے کہ بنک حکومت کی ملکیت ہے۔ اس لیے کہ جب بنک کا نقصان ہوتا ہے تو اس کی تلافی حکومت ہی کرتی ہے۔ کھاتہ داروں سے اس کو کوئی مطلب نہیں' اور جو سودی نفع ہوتا ہے وہ بھی فی الجملہ حکومت کے خزانہ کا ایک جز ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضروری ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ہی کے ذریعے حکومت کو یہ رقم پہنچائی جائے' اسے بنک ہی میں کیوں نہ چھوڑ دیا جائے۔ اس کا جواب اس سے پہلے آچکا ہے کہ اس کے ذریعے غیر مسلمین کی پوزیشن مضبوط کی جائے گی' یا اسے ایسی جگہ استعمال کیا جائے گا جس میں اسلام یا مسلمانوں کا نقصان ہو۔ یا پھر وہ سودی کاروبار کا جز بنے گا' یہ بھی تعاون علی الاثم کے تحت ممنوع ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ یہ تو اچھا نسخہ ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ادا کرنے کی نیت سے بنک میں

رقم جمع کرا دی جائے، اور جب سود ملے تو اس سے وہ ٹیکس ادا کر دیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل حکم تو یہی ہے کہ بنک میں رقم جمع ہی نہ کی جائے۔ لیکن بدرجہ مجبوری گھر میں حفاظت کی شکل نہ ہونے کی صورت میں بینک میں جمع کرنے کو جائز کہا گیا ہے۔ اسی وجہ سے فکس ڈیپازٹ کو ناجائز کہا گیا ہے کہ شروع ہی سے نیت سود لینے کی ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ غیرواجبی ٹیکس کی رقم حکومت کے خزانہ ہی میں جاتی ہو۔

اگر بنک غیر سرکاری ہے تو اس رقم کا غیرواجبی ٹیکس میں دینا جائز نہ ہو گا، اس لیے کہ اس صورت میں مالک کو واپس نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے غیر سرکاری بنک سے حاصل ہونے والی سودی رقم کا مصرف اول یعنی فقرا پر تصدق متعین ہے۔

مصرف ثالث رفاہی چیزوں میں سود کے پیسوں کا استعمال ہے۔ یہ مصرف شدید اختلافات کا شکار ہے۔ چنانچہ خود اکابرین کی دو طرح کی رائیں ملتی ہیں لیکن ناکارہ کے نزدیک دلیل کے اعتبار سے راجح رفاہ عام میں خرچ کرنے کا عدم جواز ہے۔ اس لیے کہ سود حرام ہے، اور مال حرام کا مالک نہ ملنے کی صورت صدقہ کرنا واجب ہے، اور صدقہ کی حقیقت زکوٰۃ کی طرح تملیک ہے۔ رفاہی کاموں میں لگانے کی صورت میں تملیک کا تحقق نہیں ہو پائے گا۔ علامہ شامی کی رائے سے بھی نیز امام کروری کے اس جزئیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو الجامع الوجیز میں ہے۔ نیز امام ابو یوسف ؒ کی کتاب الاثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اکابرین اس کے قائل ہیں کہ سود کے پیسے کو مدارس کی تعمیر، کنواں، راستہ، پل، رفاہ عام میں لگانا جائز نہیں۔ اگر اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو اذا اجتمع الحلال و الحرام فغلب الحرام یا اذا اجتمع المبیح و المحرم فغلب المحرم سے بھی عدم جواز میں احتیاط کا پہلو ہے۔

۵۔ مولانا جنید عالم قاسمی، پٹنہ

بنک کی سودی رقم بنک میں نہ چھوڑی جائے، بلکہ اس کو نکال کر، بلانیت، صدقہ کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اگرچہ وہ سود ہے جس کی حرمت پر نصوص صریحہ اور اجماع امت ہے، لیکن بنک میں چھوڑنے سے ایک سودی ادارہ کا تعاون ہو گا اور اس کے سودی کاروبار میں مزید ترقی ہو گی، جو تعاون علی الاثم و العدوان ہے، جس کی مخالفت نص قرآنی سے ہے۔ اس لیے و اذ بتلی ببلیتین فلیختر اھونھما کے اصول کے پیش نظر اس رقم کو نکال لینا ہی راجح ہے۔

بنک کی سودی رقم نکال لینے کے بعد اس کے مصارف کے سلسلے میں تقریباً تمام علما اس پر متفق ہیں کہ اس کو نکال کر، بلانیت ثواب، فقرا و مساکین پر صدقہ کر دیا جائے، اور نارو ا و غیرواجبی ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس وغیرہ بھی دے سکتے ہیں۔ (غیرواجبی ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی نفع مسلمانوں کو نہ

پہنچتا ہو)۔البتہ ان کے علاوہ مسلمانوں کے مفاد عام میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں' اس میں علما کے دو گروہ نظر آتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی' مفتی عزیز الرحمٰن اور مفتی شفیع صاحبان اور دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مفتیان کرام کی رائے یہ ہے کہ اس کو فقرا و مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے' رفاہ عام میں صرف نہیں کر سکتے ہیں۔ان حضرات کے پیش نظر لقطہ اور مال حرام کا حکم ہے کہ جب مالک کا پتہ نہ ہو تو ان کا تصدق واجب ہے۔ فقہا نے ان جیسے اموال کے لیے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے' اور تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔گویا کہ ایسی جگہوں پر صرف کرنا صحیح نہیں جہاں مالک بننے کی صلاحیت نہیں۔

مفتی کفایت اللہ' مفتی عبدالرحیم لاجپوری' مفتی سعید احمد' مفتی اعظم مظاہر' مولانا حسین احمد مدنی صاحبان کی رائے یہ ہے کہ اس کو مسلمانوں کے مفاد عام میں صرف کر سکتے ہیں۔مولانا مدنی تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اس کو نکال کر سمندر میں پھینک دینا' بہتر ہے بینک میں چھوڑنے سے۔ یوسف قرضاوی اور عبداللہ بن باز کا فتویٰ بھی جواز کا ہے۔ان حضرات نے عام طور پر فقہا کی عبارت وما اوجف المسلمون علیہ من اموال الحرب بغیر قتال بصرف فی مصالح المسلمین سے استدلال کیا ہے۔'

راقم الحروف کا رجحان بھی جواز ہی کی طرف ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے لاکھوں اور کروڑوں روپے بنک کے اندر سود کی شکل میں موجود ہیں۔یہ رقم بنک ہی میں چھوڑ دی جائے' یہ صحیح نہیں ہے۔یا اس کو نکال کر سمندر وغیرہ میں پھینک دیا جائے' اس کی اجازت نہ شریعت دیتی ہے اور نہ ہی کوئی عقل مند انسان۔اس لیے اس کو لامحالہ رفاہ عام میں صرف کرنا ہوگا۔

یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ فقہا نے مال حرام کے لیے لفظ تصدق استعمال کیا ہے اور لفظ تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ لفظ تصدق' صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے' جیسا کہ فقہا نے قربانی کے جانوروں کی کھال اور ان کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت' دونوں ہی کے لیے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے۔مگر کھال کا تصدق واجب نہیں ہے' بلکہ خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور کسی مالدار کو بھی دے سکتا ہے' البتہ اس کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت کا تصدق واجب ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لفظ تصدق کا استعمال صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لیے ہوتا ہے۔

فقہا کی عبارت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے آپ کو گناہ سے بری کر لے۔ لیکن کیا اس

کے مصارف وہی ہوں گے جو صدقات واجبہ کے مصارف ہیں ' اس کی صراحت نہیں ملتی ۔ جن حضرات نے اس کے مصارف صدقات واجبہ کے مصارف کو قرار دیا ہے ' ان کے پیش نظر لفظ تصدق ہے ۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ تصدق ' صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ دوسری بات یہ کہ مالک کا پتا نہ ہونے کی صورت میں مال حرام کا تصدق محض اس نیت سے ہے کہ اصل شے نہیں تو کم ازکم اس کا ثواب ہی مالک کو پہنچ جائے ۔ ظاہر ہے کہ جس طرح فقرا اور مساکین پر صدقہ کرنے سے مالک کو ثواب ملے گا اسی طرح رفاہ عام میں صدقہ کرنے سے بھی ثواب حاصل ہو گا ۔ بلکہ احادیث میں رفاہ عام میں صدقہ کرنے کو صدقہ جاریہ قرار دیا گیا ہے ۔ لہٰذا میری ناقص رائے میں مال حرام کے تصدق کا مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے آپ کو گناہ سے بری کر دے ' لیکن اس کے مصارف وہی ہوں جو صدقات واجبہ کے مصارف ہیں ' ضروری نہیں ہے ۔

نیز لقطہ کے مشابہ مان کر عدم جواز کا فتویٰ دینا دو وجہوں سے صحیح معلوم نہیں ہوتا: اول ' یہ کہ لقطہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ' کیوں کہ لقطہ میں مالک کا علم نہیں ہوتا ہے اور یہاں پر مالک کا علم ہے ۔ لقطہ میں مالک کی طرف مال کا لوٹنا ضروری ہے ' اور یہاں پر لوٹانے کے بجائے لینا ضروری ہے ۔ ثانیاً ' اگر لقطہ کے مشابہ مان لیا جائے تب بھی فقرا پر تصدق ضروری نہیں ہے ۔ اس لیے کہ لقطہ کو مسلمانوں کے مفاد عامہ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہا کی عبارتیں مختلف ہیں ۔ صاحب درمختار نے جواز کے پہلو کو اختیار کیا ہے ' گرچہ شامی نے صاحب ہدایہ وغیرہ کی عبارت سے عدم جواز ہی کے پہلو کو راجح قرار دیا ہے ۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ' فتاوی رحیمیہ ' جلد سوم)

۶ ۔ محمد عبیداللہ الاسلامی ' باندہ

جہاں تک سوال ہے حاصل کردہ سود کے مصرف کا ' تو فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ معروف ہے ۔ مولانا برہان الدین صاحب کے مطابق ' یہ امر متفق علیہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی ایسا مال ہے جس کو وہ اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا تو دو راستے ہیں: اگر مالک معلوم ہے تو اس تک پہنچائے جیسے کہ غصب کردہ مال یا لقطہ کا عام حکم ہے ۔ اگر مالک معلوم نہیں ہے اور اس کا حصول کسی عقد کے ذریعہ ہوا ہے ' اگرچہ عقد غلط ہو جیسا کہ ایک موقع پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا ہے ' یا مالک معلوم ہے مگر اب کسی طرح اس تک پہنچانا ممکن نہیں کہ نہ وہ خود موجود ہے نہ اس کے ورثا ' تو ایسے مال کا حکم یہ ہے کہ اس کو صدقہ کر دیا جائے ۔ مولانا سنبھلی نے بواسطہ ابن تیمیہ حنابلہ سے ' اور بواسطہ قرطبی مالکیہ سے بھی یہی حکم نقل کیا ہے ' اور احناف کے یہاں تو یہ حکم ہے ہی ۔ شامی وغیرہ میں لقطہ ' غصب ' رشوت سب کا حکم اسی قسم کا آیا ہے ۔ (شامی ' ج ۴ ' ص ۲۲۴)

لقطہ یا غصب کا حکم مالک تک لوٹا دینے وغیرہ کا نصوص صریحہ صحیحہ سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ حکم شوافع کے یہاں بھی ہے۔

چونکہ سود کو غصب و لقطہ سے مناسبت ہے' اس لیے بنک سے وصول کیے جانے والے سود کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کو لے کر صدقہ کیا جائے۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے لقطہ ہونے کی جہت کو یہ کہہ کر رد کیا ہے اس کے مالک نامعلوم و لاپتہ بھی نہیں' اور ان کو پہنچانے سے معذوری بھی نہیں ہے' اور یہ رقم واجب الرد بھی نہیں ہے' پھر بینک میں دی ہوئی عین رقم تو واپس ہوئی ہی نہیں۔ مگر کہا جا سکتا ہے کہ اس کو (عین لقطہ) کون کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غصب' رشوت' لقطہ' سود سب کے الگ حقائق ہیں۔ البتہ باہم ایک مناسبت اور قدر مشترک ہے جس کی بنا پر احکام میں توافق ہو سکتا ہے' اور ہے۔ سود کے صدقہ کر دینے کے حکم سے' دلیل کے طور پر' مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ کو ذکر کیا ہے۔ معارف السنن میں بواسطہ دارقطنی' حضرت امام صاحب سے ایسے اموال کے حق میں ایک روایت کو اصل بتا نا نقل کیا گیا ہے۔ یہ روایت عاصم ابن کلیبؓ کی ہے' جس میں یہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ ایک گھر میں مدعو تھے' کھانے میں بکری کا گوشت تھا۔ آپؐ نے گوشت کی بوٹی منہ میں رکھنے کے بعد فرمایا کہ بکری مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے۔ تحقیق سے یہی ثابت ہوا' تو آپؐ نے فرمایا: اسے قیدیوں کو کھلا دو۔ ابوداؤد کی ایک دوسری روایت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے' جس میں آپؐ نے' پچھنا لگانے کی اجرت کو بار بار استعمال میں لانے کی اجازت طلب کرنے پر' فرمایا اسے اپنے جانور یا غلام کو کھلا دو۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ذکر فرمایا ہے کہ حدیث میں ہے کہ ایسے مال کا یا تو تبادلہ کر لے' یا گھوڑے یا خادم کو کھلا دے' یا کافر کو اجرت میں دے دے۔ (ملفوظات عزیزی' ص ۷ ۲) مگر یہ حدیث کہاں کی ہے' اور کیسی ہے' یا حدیث ہے بھی یا نہیں' تحقیق نہیں ہو سکی۔

بہرحال نصوص صریحہ صحیحہ سے ثابت اس اصل و قاعدہ کی بنا پر سود کا جو مصرف عموماً علما نے تجویز کیا ہے وہ اس کو صدقہ کر دینا ہے۔ بقول مولانا سنبھلی جدہ کے اندر ۱۳۹۹ میں منعقد ایک فقہی و علمی مجلس کے مختلف ملکوں کے شرکا نے اس کو بالاتفاق طے کیا' اور ہمارے اکابر تو عرصہ سے یہ فتویٰ دیتے چلے آ رہے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ سود کا جیسے دینا حرام ہے لینا بھی حرام ہے' اور یہ کہ استعمال جیسے اغنیا کو منع' ویسے فقرا کو بھی منع ہے۔ شق اول کا جواب یہ ہے کہ جواز' بربنائے ضرورت ---- اسلام اور مسلمانوں کو ایسے ضرر شدید سے بچانے کے لیے ہے کہ جو سود لینے کے ضرر سے بڑھ کر ہے۔ (نظام الفتاوی' ج ا' ص ۳۲۹) اور شق ثانی کا جواب یہ ہے کہ فقرا کے لیے حلت اس لیے ہے کہ سود کا

مال اصلاً بینک کی ملک نہیں ہے، دوسرے سود دینے والوں کی ہے جو ہم کو معلوم نہیں۔ اب سود لینے والا اصلی مالک کو تو لوٹا نہیں سکتا، تو لقطہ کی طرح اس کی طرف سے صدقہ کر دیتا ہے۔

اس صورت میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی غریب کو دے دے، مسلمان ہو یا غیر مسلم، یا یہ کہ مسلمان و مستحق کی تخصیص ہے۔ مفتی نظام الدین صاحب کا میلان یہ ہے کہ تخصیص ہے۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے اولیٰ ضرور کہا ہے، مگر ضروری قرار نہیں دیا۔ باقی حضرات نے کوئی قید نہیں لگائی۔ بس یہ فرماتے ہیں کہ فقرا و مساکین و لئل حاجت کو دے دے۔ جو احادیث بطور استدلال یا مناسبات ذکر کی گئی ہیں، ان سے تو اس کی تائید ہوتی ہے کہ کوئی قید نہیں ہے۔ اس لیے کہ عاصم ابن کلیب "کی روایت میں آیا ہے کہ قیدیوں کو کھلا دو، اور وہاں قیدی کفار ہی ہوتے تھے۔ دوسری روایت میں خادم کا ذکر ہے، جو کہ غیر مسلم بھی ہوتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ایسے مال کا صدقہ کرنا واجب ہے، جس سے تخصیص کا خیال ہوتا ہے کہ صدقات واجبہ کا مصرف مسلمان ہی ہیں۔ ذمی کو صرف فطرہ مل سکتا ہے، مگر یہاں ذمی کہاں۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے حضرت تھانوی کی "الطرائف و الظرائف" سے یہ نقل کیا ہے کہ صدقہ واجبہ اور تصدق واجب کے درمیان فرق ہے، اور دونوں کے مصرف کا ایک ہونا ضروری نہیں ہے۔ مال دار لقطہ کا مستحق ہے، جو کہ واجب التصدق ہے مگر صدقہ واجبہ کا نہیں۔ ایسے ہی قربانی کی کھال اور اس کی قیمت کو صدقہ کرنے کا حکم ہے مگر کھال کسی کو دے سکتا ہے۔

دوسرا مصرف یہ فرمایا ہے کہ اس رقم کو غیر شرعی سرکاری ٹیکس میں لگا دیا جائے۔ غیر شرعی کا معیار یہ ہے کہ ایسا ٹیکس جس کی بظاہر کوئی منفعت ہم کو نہ حاصل ہو رہی ہو، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس میں۔ لیکن واٹر ٹیکس وغیرہ میں نہیں۔ البتہ مفتی عبدالرحیم صاحب بدرجہ مجبوری جبکہ ٹیکس ادا کرنے کی حیثیت نہ ہو یا بہت بوجھ ہو تب اس کی اجازت دیتے ہیں ورنہ نہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک یہ مصرف صدقہ پر مقدم اور اس سے اولیٰ ہے۔ اگرچہ اس مصرف میں لگانے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے "مال حرام بود بجائے حرام رفت"، مگر اصل بنا اس کی جو قاعدہ پیچھے گزر چکا ہے اس کی ایک شق پر ہے، کہ مملوک غیر حتی الامکان مالک تک پہنچانا چاہیے۔ بنکوں سے ملنے والے سود میں اگرچہ یہ احتمال شامل ہے کہ بنک کے قرض داروں سے لیے ہوئے سود سے کھاتے داروں کو سود دیا جاتا ہے مگر بنک تجارت بھی کرتا ہے۔ پھر کھاتے دار کا معاملہ تو براہ راست بنک سے ہی ہے اس لیے اس کا اصل مالک بنک اور حکومت ہی ہیں، تو کسی عنوان سے حکومت کو لوٹانا، اصل مالک کو لوٹانا ہے اور بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تیسرا صرف، جسے ارباب افتا میں سے مفتی عبدالرحیم صاحب نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے،

ایک موقع پر مدلل و مبرہن کر کے پیش کیا ہے، اور بظاہر یہ ان کے نزدیک ٹیکس سے مقدم ہے وہ یہ ہے کہ اسے عام مسلمانوں اور رفاہ کے عام کاموں میں استعمال کیا جائے۔ یعنی دین کی نشرو اشاعت، کوئی قومی و ملی کام و خدمت، یتامی و مساکین کی امداد، طلبہ کے وظائف، مسافرخانہ و کنواں کی تعمیر، سڑکوں کی روشنی، عوامی بیت الخلا اگرچہ مسجد کا ہو، وغیرہ میں اسے صرف کیا جاسکتا ہے۔

اس مضمون کے متعدد فتاویٰ، مفتی کفایت اللہ صاحب سے، نیز مفتی سعید احمد صاحب (سہارن پور)، مولانا مدنی، اور بعض علما مراد آباد سے منقول ہیں۔ مفتی عبدالرحیم صاحب نے لقطہ کے درجہ میں ہونے سے انکار کیا ہے، مگر کہا ہے کہ لقطہ بھی ہو تو بھی یہ مصرف ہو سکتا ہے کہ اسلامی بیت المال کے اموال میں ایک جہت یہ بھی ہوتی ہے۔ ان حضرات نے اس کی اصل یہ قرار دی ہے۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں کتاب ایسر کے مسائل کے تحت یہ مسئلہ آیا ہے۔ اہل حرب کا جو مال مسلمانوں کو، اہل حرب سے جنگ کے بغیر حاصل ہو، جسے شریعت کی اصطلاح میں "فے" کہتے ہیں، اس کا مصرف مسلمانوں کے مصالح ہیں جس کے تحت یہ سارے امور آجاتے ہیں۔

مولانا گیلانی نے ہندوستان یا دارالحرب میں سود لینے کے جواز کے سلسلے میں جو مضمون لکھا ہے اس کی بنا اسی پر ہے کہ یہ "فے" ہے لہٰذا اس کو وصول کرنا چاہیے بلکہ اس کا نہ لینا قومی و وطنی جرم ہے۔ مولانا گیلانی کے پورے مضمون کی تردید تو مودودی صاحب نے کر دی ہے اور فقہ حنفی کی رو سے، وہاں دیکھنے کے لائق ہے۔

مگر یہاں یہ عرض ہے کہ عموماً جو ہمارے حضرات نے اس شق کو نہیں اختیار کیا ہے اس کا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے کاموں میں صرف کرنے پر خود لینے والا بھی اس چیز سے، براہ راست صرف کرنے والا بھی فائدہ اٹھائے گا، اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے منع ہے۔ بقول مفتی نظام الدین صاحب اس کو تو حاصل کرنے والا نہ خود استعمال کر سکتا ہے اور نہ کسی طرح ضائع کر سکتا ہے، راستہ صدقہ ہی ہے۔ (نظام، ج ۱، ص ۳۶۷)

(ترتیب و تدوین: خرم مراد)

سائنسی اور فنی ترقی کا نظریاتی پہلو

پروفیسر عبدالقدیر سلیم

آخری قسط

ایک اسلامی معاشرے میں تحقیق و تفتیش اور ترقی کے وظائف ' سرمایہ دارانہ معیشت کے غلام نہیں ہوں گے ' بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ اول تو تعلیم و تربیت ہی ایک اسلامی معاشرے میں سادگی کے فروغ اور نمود و نمائش کی حوصلہ شکنی کا باعث ہو گی ' لیکن اگر ان اقدار کے برعکس کچھ بیمار ذہن موجود ہوں تو ان کی تسلی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی دست بستہ نہ ہوں گے۔

قرآن مجید "علم" کی بات کرتا ہے:

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر ۳۹: ۹)

کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں [علم ایک فضلیت ہے] اور وہ لوگ جو نہیں جانتے ' برابر ہو سکتے ہیں؟

یہی نہیں ' بلکہ قرآن مجید کے مطابق اللہ کی طرف سے ودیعت شدہ علم ہی وہ قابل امتیاز صفت ہے جو انسانوں کو فرشتوں کے مقابل لاتی ہے اور اسے ان پر فضیلت عطا کرتی ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (البقرہ ۲: ۳۱)

[اللہ نے] آدم کو تمام اسما سکھائے اور پھر انھیں فرشتوں کے روبرو پیش کیا۔

قرآن مجید "آیات" کی بات کرتا ہے ' مثلاً:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (حم سجدہ ۴۱: ۳۹)

اور اس کی آیات میں سے یہ ہے کہ تم زمین کو افتادہ دیکھتے ہو ' تو پھر جب ہم نے اس پر بارش برسائی تو اس میں جان پڑ گئی ---- اور:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حم سجدہ ۴۱: ۵۳)

ہم اپنی آیات عن قریب انھیں آفاق ، اور ان کے انفس میں دکھائیں گے ، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہی حق ہے ۔

قرآن مجید "حکمة" کی بات کرتا ہے:

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (البقرہ ۲: ۲۶۹)

جسے حکمت عطا کر دی گئی گویا اسے خیر کثیر دے دیا گیا۔

مگر اب علم و حکمت کا مفہوم ہی بدل گیا ہے ۔ بدقسمتی سے انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب کے سیاسی تسلط ، اس کی فوجی برتری اور خوش حالی کو اس کی مخصوص سائنسی فکر کا نتیجہ قرار دیا گیا ۔ یہ بڑی حد تک اس کے استحصال ، قدرتی وسائل کی بے محابا لوٹ مار اور ساری دنیا کو نچوڑ کر محدود علاقوں اور ایک محدود آبادی کو لذت و مسرت کے جرعوں سے فیض یاب کرنے کی پالیسی کی بنا پر تھا (ایک دوسری شکل میں یہ صورت اب بھی ہے) ۔ اور لوگوں کی طرح برصغیر میں سر سید احمد خاں نے سائنٹی فک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دس مقاصد میں سے پہلا "مسلمانوں میں یورپین سائنس و لٹریچر کی اشاعت اور اعلیٰ تعلیم کی کوشش کرنا" قرار پایا ۔ "علم الادیان" (یعنی انسان ، اس کی ماہیت اور کائنات میں اس کے مقام کی تفہیم) کی بجائے "علم الابدان" یعنی طبیعی علوم اور ان کے جاننے والوں کو مسند فضیلت پر بٹھایا گیا ۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں "علم" اور اس سے متعلقہ صیغے استعمال ہوئے ہیں ، ان سے مراد علوم طبیعی لیے گئے کہ انھی میں پسماندگی ، ہماری ماندگی کا باعث ہے ، اور ان میں ہماری پیش رفت ہی اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور دنیا و آخرت میں ہماری فلاح کا باعث ہوگی ۔ جہاں جہاں "آیات" کا لفظ استعمال ہوا ہے ، اس سے "فطرت" (خالص مغربی اصطلاحی معنوں میں) مراد لی گئی ۔

"حکمت" کی اصطلاح بھی ربانی تقدیس سے محروم کر کے خالصتاً مادی مفہوم کے ساتھ منسلک کر دی گئی ۔ بہت زیادہ ستم ہوا ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر کہ "حکمت ، مومن کی گم شدہ اونٹنی / متاع ہے" ۔ اور اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ ہر قسم کے علم اور فنیات کے ہر جگہ سے اخذ کر لینے کی تو ہمیں ہدایت کی گئی ہے ۔ مغرب سے در آمد ہونے والی ہر دریافت کو اپنا لینے اور وہاں تشکیل پانے والی ہر ٹیکنالوجی کو اپنے ہاں مروج کر لینے کے لیے اس قول کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی عرب یا غیر عرب کے قول اطلبوا العلم ولو بالصین (علم حاصل کرو ، چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو) ---- جو اصولاً ایک درست رویے کی ہدایت کرتا ہے ---- کو حدیث پاک کے طور پر پیش کیا جانے لگا کہ یہ ہدایت تو ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ ہم چین (یا دنیا کے کسی بھی غیر مسلم ملک یا قوم) سے "علم" ، یعنی "سائنسی علم" حاصل کر لیں ، کیوں کہ چین سے "مذہب اسلام"

یا علوم الٰہیہ کا اخذ تو بہر حال نہیں ہو گا' لا محالہ یہاں مراد ''سیکولر'' یا غیر مذہبی علم و دانش ہی سے ہے۔

میرے خیال میں سیکولر علوم میں پیش رفت کی ساری مجنونانہ کوششیں' جو اب کئی مسلم ملکوں میں اور معاشروں میں ''ترقی'' کے واحد ذریعے کے طور پر قبول کر لی گئی ہیں' گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کی کوشش کے مترادف ہیں۔ اولاً تو ایک زندہ و بیدار قوم کی نشو و نما ہمہ گیر و ہمہ جہت ہو گی' کسی ایک شعبے میں نہیں۔ دوسرے اگر کسی شعبے میں اس نے غیر معمولی ترقی کر بھی لی' تو اس کا نتیجہ جلد یا بہ دیر وسیع تباہی کی صورت ہی میں نمودار ہو گا۔ بیسویں صدی کی دو بڑی جنگیں اور درجنوں مقامی جنگیں' جن میں کروڑوں انسان ہلاک ہوئے' قدرتی وسائل کی بے تحاشا بربادی ہوئی (جو وسائل انسان کی فلاح کے لیے استعمال ہو سکتے تھے) اور انسانیت ایسی تباہیوں سے دوچار ہوئی' جن کی نظیر' انسان کی دس لاکھ سال کی تاریخ میں نہیں ملتی' وہ اسی طرح کی ''ترقیوں'' سے ممکن ہوئیں۔

ایک اسلامی معاشرے میں سائنس و حرفت کے اہداف واضح طور پر متعین کیے جا سکتے ہیں' اور انھی کی روشنی میں ان کی سرگرمیوں کو منظم کیا جانا چاہیے۔ مثلاً' جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں' ایک اسلامی معاشرہ' مسرفانہ معاشرہ نہیں ہوتا۔ ایک اسلامی معاشرے میں بازاری معیشت (منڈی کی معیشت) کو ایک ضابطۂ الہامی کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا' بلکہ وہ انسان دوستی اور خیر خواہی پر اساس رکھنے والا معاشرہ ہوتا ہے۔ اسلامی فکر کے مطابق تمام انسان' بلکہ تمام مخلوق ''عیال اللہ'' ہوتی ہے۔ چوں کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں' لہٰذا انھیں دھوکا دینے' لوٹ لینے' ابلاغ عامہ یا دوسرے ذرائع سے ان کا استحصال کرنے کا کوئی تصور یہاں نہیں ہو گا۔ چوں کہ اس بھری پُری دنیا کے سارے وسائل درحقیقت اللہ کی مِلک ہیں' اور ان میں انسان کا تصرف ایک امین سے زیادہ کا نہیں' اس لیے ''وسائل فطرت کے استحصال'' جیسا کوئی تصور یہاں نہیں ہو گا۔[۱۱] ان اصولوں کی روشنی میں سائنس و حرفت کے لیے کچھ ضابطے متعین کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ میرے خیال میں اسلام میں حصول علم' انفس و آفاق میں آیات پر غور و تفکر' حکمت کی تلاش' صنعت و حرفت کی ترویج' اور اس طرح کے تمام احکام ایک نہایت کلیدی تصور ----- ''توحید'' ----- کے ساتھ غیر منفک طریقے سے وابستہ ہیں۔ اسلام کے نزدیک تمام مرغوب علوم کا سرچشمہ ذاتِ الٰہی ہے' کہ اسی نے اولاً آدم کو علم سکھایا تھا۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کائنات میں ہر خیر' نیکی' بھلائی' حسن و خوبی' اور تعمیر کا سرچشمہ بھی ذات الٰہی ہی ہے۔ اس کے برعکس علاماتِ شر' بدی' برائی' قبح و نقص اور فساد و تخریب شیطان کی طرف سے ہیں' جو انسان کا ازلی دشمن اور اللہ تعالیٰ کا باغی اور فسادی ہے۔

۲۔ ایک نظریاتی ریاست اور معاشرے پر لا محالہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی علم' حرفت

اور ٹیکنالوجی میں تحقیق و پیش رفت سے پہلے ہی اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کرے، کہ اس کے مضمرات کیا ہیں؟ شاید میری یہ معروضات قبولیت اور پسندیدگی کا مقام حاصل نہ کر سکیں گی، مگر میں خلوص دل اور دیانت داری سے یہی سمجھتا ہوں کہ جینیاتی تالیف و تحریف ۱۲؎، انٹرنیٹ کا نظام (WWW)، الیکٹرانک میل (e-mail) ۱۳؎، کمپیوٹر کا بے محابا استعمال، ٹی وی کا فروغ، ہائی ٹیک میڈیسن اور سرجری، سریع الحرکت نظام ہائے رسل و رسائل کی روز افزوں ترقی، کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی ترقی اور تیاری، جغرافیائی اور ارضیاتی ماحول کی بڑے پیمانے پر تبدیلی کی کوششیں، انسان کو خود سائنسی حرکیات و منطق کا غلام بنائے دے رہی ہیں۔ ان کی تعمیر اور استعمال میں ناپسندیدہ اخلاقیات کے کھلے کھلے مضمرات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ٹی وی کی معصوم ٹیکنالوجی ہی کو لیجیے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس کا اچھا استعمال کریں گے، لیکن کیا اس صنعت و حرفت کی ترقی سے یہ کوئی دور کی بات ہے کہ ایسے دروں ساختہ ڈش انٹینا وجود میں آجائیں، جو دنیا کے سارے پسندیدہ اور ناپسندیدہ چینل آپ کے بچوں کی دسترس میں لے آئیں۔ انٹرنیٹ (WWW) سے صالحین و شیاطین ہر کوئی بہتی گنگا میں اپنا اپنا امرت اور زہر، کوڑا اور غلاظت اور مقدس و مطہر انڈیلنے میں نہ صرف آزاد ہے، بلکہ فی الواقع ایسا کر بھی رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں، ہمیں تو یہ اختیار ہے کہ اس بہتے دریا سے جو چاہیں، لیں اور جو چاہیں نہ لیں۔ مگر یہ بالکل وہی دلیل ہوگی کہ آپ ہر کتب فروش اور ویڈیو کے درآمد کنندہ کو ہر کتاب، فلم اور کیسٹ کی درآمد و فروخت کی کھلی اجازت دے دیں اور کہیں کہ یہ اختیار تو بالآخر خریدار ہی کا ہے کہ وہ کیا لیتا ہے، کس سے اغماض برتتا ہے، اور کسے رد کر دیتا ہے۔ پھر کتب فروش آپ کے گھر میں ساری کتابوں کا ڈھیر تو لاکر نہیں ڈال دیتا کہ اس میں سے جو چاہے لے لیجیے اور جسے آپ نہیں چاہتے، نہ لیجیے۔ سیٹلائٹ، ڈش، انٹرنیٹ اور ای۔میل آپ کے گھر کے اندر ہر وہ چیز آپ کو مہیا کر دیتے ہیں جو "عباد الرحمٰن" اور "عباد الشیطان" صالحین و طالحین کو مرغوب و مطلوب ہو سکتی ہے، بلکہ آپ کے چاہے بغیر بھی وہ ایسا کر سکتے ہیں، (اور کر رہے ہیں)۔ اب یہ کوئی مستقبل بعید کا امر امکانی نہیں، بلکہ غیر ملکی پریس میں یہ کہانیاں ایک گرم موضوع بن گئی ہیں کہ معصوم گھر کس طرح اس عالمی شیطانی جال سے پریشان ہو رہے ہیں۔ ایک اسلامی نظریے پر مبنی معاشرے میں ان نظاموں کی ترویج غور طلب ہوگی۔

۳۔ مغرب میں ایسے کئی منظرنامے بڑی سنجیدگی سے زیر بحث ہیں، جن میں ایک دشمن قوت کس طرح بغیر ہتھیار اٹھائے برقیاتی ڈاک، انٹرنیٹ، کمپیوٹر وائرس اور دوسرے برقیاتی نظاموں کے ذریعے اعلیٰ درجے کے ترقی یافتہ مربوط اطلاعاتی ذخیروں اور نظاموں کو تہس نہس کر سکتی ہے۔ مواصلاتی نظاموں کو ناکارہ، بینکوں کو دیوالیہ، ہوائی مستقر کو ناقابل استعمال، جنگی طیاروں کو اندھا اور مفلوج، اور

ساری عسکری مشین کو برباد و منتشر کر سکتی ہے۔ مگر یہ "برقیاتی جارحیت" امریکہ یا اس جیسے کسی "بے حد ترقی یافتہ" ملک ہی کے خلاف ممکن ہے، جس کے سارے ماحولیاتی، مواصلاتی اور عسکری نظام، جدید ترین برقیاتی مشینوں کے مرہون منت ہوں۔ اس جارحیت کے خلاف ان کا موثر ترین دفاع، ان کے دانش وروں کے نزدیک یہی ہے کہ دشمن قوت (مثلاً کوئی اسلامی ملک) بھی اس طرح کے اعلیٰ ترین "ترقی یافتہ" برقیاتی نظاموں سے لیس (یا ان کی گرفت میں) ہو، تاکہ جارحیت کی صورت میں اسے بھی اس طرح کی جوابی جارحیت کا امکانی خطرہ ہو۔ میں The Economist، لندن (۱۳ جنوری، ۱۹۹۶) کی ایک رپورٹ کے آخری پیراگراف کی چند سطور پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

"The theoritical danger of cyber war has put the country in an odd position. Military planners normally want to be ahead in the technological game, but, in a way the more "wired" a country is, the more vulnerable it is to this sort of attack. May be America's best defence is to encourage potential enemies to become equally dependent on information technology. Then there would be scope for retaliation".

ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے پالیسی سازوں کو جدید فنیات کے فروغ میں مضمران امکانات پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

۴۔ مغرب میں (اور اب اس کے زیر اثر ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں میں بھی) ٹیلی وژن، بلکہ ابلاغ عامہ کے دوسرے تمام ذرائع کے جو اثرات، ثقافت و تہذیب کی بربادی، خاندان اور سماجی رشتوں کے اتھل پتھل اور مسلمہ اعلیٰ انسانی اقدار کے سقوط و زوال کی صورت میں نمودار ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے سبھی اصحابِ فکر تشویش میں مبتلا ہیں۔ امریکی عالم عمرانیات نیل پوسٹ مین کا دعویٰ ہے کہ سماج اور اقدار کی اس وسیع بربادی کا مابعد جدید فنیات (post-modern technology) کے ساتھ ناقابل انقطاع رشتہ ہے، کیوں کہ اس ٹیکنالوجی کی اثر انگیزی اور قوت بے کنار ہے، اور یہ فی نفسہ ہمہ مقتدر بن جانے کا رجحان رکھتی ہے۔

۱۹۶۰ کے عشرے میں امریکی پالیسی ساز اور دانش ور بریزنسکی نے کہا تھا کہ ہم اب اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں، جسے اس نے تکنیکی برقیاتی عہد (techō-tronic age) کہا تھا۔ پوسٹ مین کے خیال میں امریکی معاشرہ ہی سب سے پہلے اس مابعد جدید فنیات کا شکار ہوا ہے، جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے بے اخلاق ہی نہیں، بلکہ بد اخلاق بھی ہے۔ اس نئے نظام میں فیصلہ کی قوت کسی شخص یا کسی معاشرتی ادارے کے ہاتھ سے چھن گئی ہے، اور غیر محسوس طریقے سے، ایک تدریج کے

ساتھ یہ اختیار مشین اور کمپیوٹر کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔

پوسٹ مین نے اس نئے نظام کو technopoly کا نام دیا ہے۔ اس کے تحت ٹیکنالوجی، مشین، برقیاتی ذرائع ابلاغ و علم، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ای۔میل نے تمام جہات میں انسانی معاشرے کی زمام کار پوری طرح خود اپنے ہاتھ میں لے لی ہے، اور اس نئے فنیاتی نظام کے ہاتھوں افراد اور پورے پورے معاشروں کو لاچار اور بے بس بنا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب فرد اور معاشرے کے اختیارات اور ذمہ داریاں بھی بری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ معاشرے کو اپنی ثقافتی اقدار متعین کرنے، اپنی فکر اور حد یہ کہ اپنی اخلاقی قدروں کے تعین کی بھی آزادی نہیں رہی ہے۔ انسانوں کے ہاتھ سے اختیار، ابتداً انسان ساختہ مشینوں کو منتقل ہوا، پھر مشین ساختہ، مشینوں کو۔ جب تک مشین کو ڈیزائن کرنے اور اس کی صورت گری مکمل طور پر (تقریباً) انسان کے ہاتھ میں تھی، اسے کچھ نہ کچھ اختیار حاصل تھا کہ وہ کیا بنائے اور کیا نہ بنائے۔ مثلاً وہ کسی مضر ایجاد کو، وسیع طور پر پھیلنے سے روک سکتا تھا۔ مگر اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ معاشرے کی صحت کے لیے درکار اس کا حفاظتی نظام بری طرح متاثر ہو چکا ہے۔ ۱۱۷ص

پیغامات کی ترسیل کی ایک نہ رکنے والی بارش ہے، جس نے متعلقہ اور غیر متعلقہ معلومات کی حدوں کو دھندلا دیا ہے، اور ایک ایسا شور و غوغا پیدا کر دیا ہے کہ معنی آوازوں میں گم ہو گئے ہیں۔ معلومات کے ان لاکھوں اجزا کو مربوط کرنا اور بامعنی نتائج کا استخراج انسان کے بس کی بات نہیں۔ لامحالہ "مصنوعی ذہانت" اور کمپیوٹر سے مدد لے کر ہی یہ فیصلے کیے جاتے ہیں کہ ان معلومات کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ کون سی مصنوعات، کس قیمت پر، کتنے اشتہاری بجٹ کے ساتھ، اور کب بازار میں لانی ہیں۔ مشین جو اولاً کارزار حیات میں انسان کی مدد کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر آئی تھی، اب نہ صرف جنگی حکمت عملی کا تعین کرتی ہے، بلکہ اس کے اہداف بھی خود متعین کرتی ہے اور یہ فیصلہ بھی کرتی ہے کہ حریف کون ہے اور حلیف کون۔ کسے نابود کرنا ہے اور کسے باقی رکھنا ہے، کیا قربان کر دینا ہے اور کسے بچانا ہے؟ امریکی اب اس صُور کی آواز کو سن رہے ہیں، جو روایتی طور پر ابتداً دھیمی اور مدھر تان سے شروع ہوتا ہے، تاہم وہ اس کے سحر میں مسحور ہیں، جب کہ دوسرے ملکوں میں بھی یہ سحر پہنچ چکا ہے۔ اس کے عواقب و نتائج اگرچہ اضطراب انگیز ہیں، تاہم اسے رد کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ ان کے لیے، اس مابعد الطبیعیات کے ساتھ جو انھوں نے اختیار کر لی ہے، اس آرکسٹرا کو ختم کرنا اب شاید ممکن بھی نہیں۔

بات یہ ہے کہ سائنس اور فنیات کی انسان پر بالادستی اور ہمہ جہتی اقتدار کے نتیجے میں جو نظام وجود میں آیا ہے، اس میں کسی فوق الفطرت ہستی کی حاکمیت کے تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں، روحانیت

کی کوئی گنجایش نہیں، اور اقدار کا تعین بھی سراسر غیرانسانی، مشینی رویوں اور ترجیحات ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے، کیوں کہ انسان بھی ایک مشین ہی ہے۔ ان کے نزدیک علیم و خبیر خدا کی جگہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے لے لی ہے، فیصلہ کن قوت بھی اسی کے پاس ہے۔ اگرچہ وہ فیصلے انسان کے ہاتھوں کراتا ہے، اور اس کے ذریعے نافذ بھی کراتا ہے۔ مسلم سائنس دانوں اور دانش وروں کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ وہ ان "مصنوعی ذہانت" کی حامل اور اطلاعی مشینوں کو کس طرح قابو میں رکھیں، کہ وہ ان پر حاوی اور حکمراں نہ ہو جائیں، اور باندازِ دگر "خاندان غلاماں" کی بادشاہت کا پھر سے باب نہ کھل جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کمپیوٹرز اور اطلاعی نظاموں کو کم سے کم اور صرف ناگزیر مخصوص حالات ہی میں استعمال کیا جائے۔ جو امور ان کے بغیر انجام دیے جا سکتے ہوں، یہ اہتمام ہو کہ ان میں انھیں زحمت نہ دی جائے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان نظاموں میں استعمال ہونے والے تمام آلات حتیٰ کہ software اور کاغذ تک باہر سے درآمد ہوتے ہیں، اور ان مشینوں کی نئی نسلیں اس تیزی سے وجود میں آرہی ہیں کہ جتنے عرصے میں آپ ایک مشین بنانے کے قابل ہوتے ہیں، دوسری، آپ کی طمع بھری نظروں کے سامنے ہوتی ہے۔ اس لامتناہی سلسلے کو ختم ہونا چاہیے۔ [۱۴]

۵۔ دنیا کی آبادی، جو اس صدی کے شروع میں دو ارب سے کم تھی، اور صدی کے نصف میں اڑھائی ارب ہو چکی تھی، اب سات ارب کی حد کو چھو رہی ہے۔ [۱۵] اس کی مادی اور سماجی ضروریات کو پورا کرنا اور ان کے لیے وسائل مہیا کرنا ایک مسئلہ ہے، جس کے لیے سائنس اور فنیات نے آگے بڑھ کر ہماری مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر دوسری طرف اس کے عواقب و نتائج جس بھیانک انجام کی طرف لے جا رہے ہیں، اس کی ابھی چند جھلکیاں ہی نظر آسکی ہیں۔ امریکہ اور یورپ کی آبادی ان کی زمینوں اور رقبوں کے تناسب سے بہت کم ہے، اس لیے اس انجام کی صحیح اور مکمل تصویر وہاں نظر نہیں آسکتی، لیکن اس کے نمونے بھارت میں کلکتہ اور بمبئی، نیز ہانگ کانگ، بنکاک اور برازیل میں نظر آتے ہیں۔ [۱۶] جنگل کاٹے اور جلائے جا رہے ہیں۔ ہائیڈرو کاربن اینڈ حسن، کیمیائی، نیوکلیائی اور دوسرے فضلوں سے فضا آلودہ اور کرۂ ارض گرم ہوتا جا رہا ہے۔ اوزون کی چھتری میں شگاف پڑ چکا ہے، اور انسانی زندگی کی بقا کی کیفیت بگڑتی جا رہی ہے۔ تاہم بہت سے دانش ور جو جدید سائنس اور فنیات کے تباہ کن اثرات کا شعور رکھتے ہیں، یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ جدید فنیات کو، اس کے بعض منفی اثرات کو منہا کر کے بھی رواج دیا جا سکتا ہے۔ فنیات کے مفید اثرات اور مثبت پہلوؤں کو قبول کر لینا چاہیے، اور اس کے منفی اور مضر عناصر کو رد کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ نئی فنیات ایک مکمل نظام ہے۔ یہ بھی اسلام کی طرح گویا کہ "ایک مکمل ضابطہ

حیات" ساتھ لاتا ہے۔ اس کے "اچھے" اجزا کو "برے" اجزا سے جدا نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سب مل کر ہی ایک اکائی بناتے ہیں۔

مثال کے طور پر آمد و رفت کے جدید نظام کو لیجیے۔ اندرونی احتراق کے انجن کی ایجاد نے کار اور موٹر سازی کو ممکن بنایا، جس سے تیز رفتار اور بہ سہولت آمد و رفت ممکن ہوگئی۔ لیکن اس کے نتیجے میں بڑے بڑے شہر بھی وجود میں آئے، جن کا سلیقے کے ساتھ انتظام ناممکن ہوگیا ہے۔ شہروں کی فضا آلودگی اور شور سے بھر گئی۔ سکون، یکسوئی اور احساسِ طمانیت رخصت ہوئے۔ صنعت و حرفت اور تجارت و کاروبار کے ان عظیم مراکز میں صبح و شام لاکھوں کارکنوں کی آمد و رفت اور کروڑوں ساعتوں کے ضیاع کے مسائل پیدا ہوئے۔ جسمانی اور ذہنی دباؤ کے نتیجے میں جو جسمانی عوارض، نفسیاتی امراض، تشدد، جنون اور کھوکھلی زندگیاں وجود میں آچکی ہیں، ان سے کون واقف نہیں؟ جدید بلادِ عظیم (megapolis) نے سماج اور معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت میں جو کردار ادا کیا ہے، اس سے انکار ناممکن ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں صنعتی معاشرہ اور نظام سرمایہ داری ہم معنی تھے، تب کارل مارکس ایسے معاشرے میں مغائرت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے خبردار کر رہا تھا۔ اس کی بھول یہ تھی کہ یہ صورت حال صرف بازاری معیشت والی سرمایہ داری کی پیداوار نہ تھی، بلکہ نئی فنیات سے ظہور میں آنے والے وسیع صنعتی و حرفتی نظام کا تقاضا تھی۔ اب مغرب میں بھی بہت سے دانش ور اس صورت حال سے پریشان ہیں، مگر انھیں اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ مسلم مہندسوں/ انجینیروں اور شہری منصوبہ سازوں کے لیے چیلنج یہ ہے کہ کس طرح چھوٹے، خود مکتفی اور صاف ستھرے شہر ڈیزائن کیے جا سکتے ہیں، جو ان مسائل سے پاک ہوں۔ مزدوروں اور کارکنوں کو مقام کار سے قریب رہایش کی سہولت ہو، جہاں سواری کی بھی ضرورت نہ ہو، اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ قیمتی ہدایت ہمارے لیے مشعل راہ ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی فلاں مقام تک پہنچ جائے، تو شہر کو مزید وسعت نہ دینا، اور نیا شہر آباد کر لینا۔

۶۔ نئی سائنس سے وجود میں آنے والی جدید طب پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بلاشبہ اس طب کے نتیجے میں کئی امراض کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ طاعون، ہیضہ، آتشک اور تپ دق پر قابو پایا جا چکا ہے۔ (اگرچہ بعض گوشوں سے یہ تشویش ناک اطلاعات بھی آرہی ہیں کہ تپ دق ایک نئی صورت میں واپس آرہا ہے)۔ لیکن اس ضمن میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: ایک یہ کہ جدید طبی ترقی کا سارا انحصار، خلاف حیوی ادویات، جدید کیمیا، حیاتیات، طبیعیات، برقیات اور کمپیوٹر کی سائنس اور فنیات پر ہے۔ ان سب میدانوں میں تحقیق و تفتیش اور ان کے نتیجے میں آلات سازی نے معالجہ کو ایک نہایت مہنگا نسخہ بنا دیا ہے۔ سادہ تشخیص و تجویز اور علاج کی بجائے اب تشخیص، تفتیش اور تجویز کے لیے جو

"ہائی ٹیک" سازوسامان درکار ہوتا ہے، نادار افراد، معاشرے اور ملک اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان کا بوجھ، فنیاتی طور پر "ترقی یافتہ" ایک امیر ملک یا معاشرہ ہی اٹھا سکتا ہے، یا غریب ملک کے وہ بڑے دولت مند افراد جو باہر جا کر ان برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

اسلام، اصولی طور پر تعلیم و علاج میں اس طرح کی تفریق کے خلاف ہے۔ مسلم سائنس دانوں، اطبا اور جراحوں کو Hi-tech medicine یعنی مہنگے معالجے کی بجائے ارزاں طریق علاج کو پروان چڑھانا چاہیے۔

نئی سائنس اور فنیات نے جہاں کچھ امراض کا خاتمہ کیا ہے، نئی دوائیں اور معالجے اختراع کیے ہیں، یا جان بچانے والی دوسری تدبیروں کی راہ دکھائی ہے، وہاں بعض نئے عوارض بھی پیدا کر دیے ہیں۔ نفسی۔جسمی عوارض کے نتیجے میں بڑے صنعتی ملکوں کی آبادی کا خاصا بڑا تناسب نفسیاتی توازن اور مسرت سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ چرس، حشیش، کوکین، ہیروئن، کیفین جیسی کیف آور، سکون بخش ممنوعہ اکسیرہائے حیات کے بعد اب Prozac اور اس قبیل کی قانونی منشیات کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ نفسی۔جسمی عوارض میں افسردگی، مستقل تھکن کا احساس، بلند فشار دم، ذیابیطس، سرطان، ایڈز اور پھیپھڑوں کی متعدد بیماریاں عام ہیں۔ ان میں سے کئی امراض کا ہائی ٹیک معاشرے کے ساتھ تعلق بہت واضح ہے۔

سماجیات، نفسیات، نفسی معالجے اور دوسرے عمرانی علوم کے مسلم علما کو جدید اور مابعد الجدید دنیا کے ان انسانی مسائل کا حل، اسلامی فکر و فلسفہ کی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا، جسے میرے خیال میں ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسان، دنیا میں انسان کی طرح رہے، خدا بننے کی کوشش نہ کرے۔

اس مضمون میں نئی سائنس و فنیات پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے، جو نظریے کے حوالے سے ناگزیر تھی۔ اب کیا سائنس دانوں کو اپنی دریافتوں اور تحقیق و تفتیش پر خود آگے بڑھ کر کوئی قدغن لگا دینی چاہیے۔ مغرب میں سائنس دانوں اور دانش وروں کا ایک چھوٹا سا گروہ اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ مگر شاید یہ ممکن نہیں۔ شاید ضرورت یہ ہے کہ سائنسی تحقیق و دریافت کی کچھ حدود و قیود ہوں۔ جو کچھ حاصل ہو چکا ہے، پہلے اسی علم کا سلیقے اور تدبر سے انتظام کرنے کی کوشش کریں۔ یہاں انتخاب، جہل کی تاریکی اور علم کی روشنی کے درمیان نہیں، بلکہ مناسب روشنی اور اس خیرہ کن چکاچوند میں ہے، جو بصارت اور بصیرت دونوں کو زائل کر دیتی ہے، اور پھر حادثے کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں کوئی "لُدّائی" کا رویہ نہیں، بلکہ دانش اور خیر طلبی کا تقاضا ہے۔

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا (الاحزاب ۳۳:۷۲)

"ہم نے امانت کو آسمانوں' زمین اور پہاڑوں کے آگے پیش کیا' تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا' اور اس سے خوف زدہ ہو گئے' لیکن اسے انسان نے اٹھا لیا' بے شک وہ بہت ہی ظالم اور جاہل تھا"۔

یہ امانت کیا تھی؟ اس عمومی علم کی' جو مُحیطِ کُل ہے' جب کہ فرشتے' جاندار و بے جان سب عرفان الٰہی کے ساتھ اپنی مخصوص ماہیت اور خصوصی وظائف کا علم رکھتے ہیں۔ "علم اسما کی جہاں گیری" کے ساتھ انسان نے اپنے اس کردار کی ہامی بھرلی' جو نہایت خطرناک گھاٹیوں اور رہ گزاروں سے ہوتا ہوا اسے جنت کی طرف بھی لے جا سکتا ہے اور جہنم کی طرف بھی۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ "جس دن ہم جہنم سے پوچھیں گے 'کیا تو بھر گئی ہے؟ اور وہ کہے گی: ھل من مزید؟" ۱۵ یہ "ھل من مزید" جہنم ہی کی پکار نہیں' فطرت انسانی کی بھی پکار ہے۔ صحت مند بھوک' انسانی صحت و نشوونما کی ضامن ہے مگر جوع البقر اور استسقا اجل کے پیغام بر ہیں۔ اسی طرح علم و حرفت کی بے قید طلب اور ہوس بھی پورے پورے معاشروں بلکہ ساری انسانیت کے لیے پیک اجل ہے۔ ہمارے اور ساری دنیا کے پالیسی ساز اس حقیقت کو جس قدر جلد پالیں اور اس کے مداوا کی تدبیر کر لیں' اسی قدر بہتر ہو گا۔

اند کے پیشِ تو گفتم غمِ دل ترسیدم که تو آزرده شوی ورنه سخن بسیار است

حواشی

۱۱۔ یہ ظالمانہ اصطلاح اب بے تکلفی سے مسلم اور غیر مسلم سبھی استعمال کرتے ہیں۔

۱۲۔ فلیغیرن خلق اللہ۔ شیطان نے کہا "میں انھیں ضرور گمراہ کروں گا' انھیں ضرور امیدیں دلاؤں گا' اور ضرور ہی انھیں حکم دوں گا..... تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدل دیں گے" (النسا ۴:۱۱۹)

۱۳۔ World Wide Web ایک ایسا بے تار برقی کا جال ہے' جس کے ذریعے کمپیوٹر اور متعلقہ آلات رکھنے والے ان ساری "معلومات" اچھی اور بری' مطلوب و نامطلوب سے مستفید ہو سکتے ہیں' جو اس نظام میں "انڈیلی" جا چکی ہیں' اور اس "بہتی گنگا" میں ہر ایک اپنا علم و حکمت اور جہالت و گندگی داخل کر سکتا ہے۔ e-mail آپ کا برقیاتی ڈاک کا ڈبہ ہے' جس میں ہر شخص اپنا برا "پیغام" ڈال سکتا ہے۔

۱۴۔ تھیوڈور جے کیچ زنسکی (Kaczynski)' اور نام نہاد "یوناباممبر" سائنس اور ٹیکنالوجی کے نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں۔ جدید Technopolity نے اٹھارہ سال کی تگ و دو کے بعد (اگر یہ بات صحیح ہے تو) اس ننھی سی پھانس کو ڈھونڈ نکالا ہے' جو اس کے لیے ایک امکان بعید کا خطرہ بن سکتی تھی۔ اب اس پر سائنس دانوں کے قتل اور سائنسی اسٹیبلشمنٹ کو تباہ کرنے کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ جدید سائنسی و فلسفیانہ

ریاست کے لیے اگرچہ کیچ زنسکی کا تجزیہ بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن اس مسئلہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس کا طریق درست نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ حیات انسانی کی باوقار بقا کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

15- Paul Kennedy, pp 23 ,33.

16- Herbert Giradet: The Gaia Atlas of Cities, (Sick Cities, Sick World), pp. 67-115, Anchor Books, New York, 1992.

۱۷- Luddites، ۱۸۱۱-۱۳ میں مشینوں کے خلاف بلوہ کرنے والے، جو ایک فرضی کردار جنرل لد کے پیروکار بتائے جاتے تھے، اور ان کا دعویٰ تھا کہ مشینی صنعتی انقلاب، بے روزگاری اور انسانی فلاکت کا باعث ہو گا۔

۱۸- یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (ق ۵۰: ۳۰)

قرآن کے مطابق:

اگر کوئی مسلمان رسول اللہؐ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرے، تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔ (ایسے ایک شخص کی حضرت عمرؓ نے گردن اڑا دی تو ان سے پرسش نہ کی گئی)

آج ہماری روز مرہ زندگی کی کتنی ہی باتیں ہیں جن کے بارے میں رسول اللہؐ کی ہدایات --- کوئی مقدمہ لے جائے بغیر ھی، آپ کے فیصلے --- موجود ہیں۔

ہم انھیں جانتے بھی ہیں،

پر ہم انھیں عملاً تسلیم نہیں کرتے!

اور اپنے ایمان سے مطمئن بھی ہیں!!

(بندۂ خدا)

خطوطِ مودودیؒ : ایک تاثراتی مطالعہ

پروفیسر خورشید احمد

آخری قسط

راہِ عمل

خطوطِ مودودیؒ اگر ایک طرف ایمان افروز جذبات کا مرقع ہے تو دوسری طرف خود اس کارِ عظیم کا بڑا ہی واضح نقشہ بھی ان میں سامنے آتا ہے جو داعی انجام دینا چاہتا ہے اور جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کے شب و روز وقف کر دیے ہیں۔ ان خطوط میں وہ جواہر ریزے موجود ہیں جو کئی کتابوں پر بھاری ہیں۔

چودھری نیاز علی خاں صاحب کو ۱۴ مارچ ۱۹۳۷ء کے خط میں حیدر آباد، دکن سے لکھتے ہیں اور اپنی دعوت اور اس کے اہداف کی کتنی سچی اور موثر تصویر کھینچتے ہیں:

"ہم خالص قرآن کی بنیاد پر اسلام کی نشاتِ جدیدہ (renaissance) چاہتے ہیں۔ قرآن کی اسپرٹ اور اسلام کے اصول ہمارے نزدیک غیر متبدل ہیں، مگر افکار اور معلومات کی ترتیب اور عملی زندگی کے احوال پر اس روح اور ان اصولوں کا انطباق ہمیشہ احوال کے تغیر اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلنا ضروری ہے۔ متقدمین اسلام اس چیز کو سمجھتے تھے، انھوں نے اپنے زمانے میں عملاً اس کو برتا، مگر متاخرین یہ سمجھے کہ اصول اور اسپرٹ کی طرح ان کا انطباق بھی غیر متبدل ہے۔ اسی چیز نے وہ جمود پیدا کیا جو سات سو برس سے ہمارے علوم اور ہمارے قوانین حیات پر طاری ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے اس جمود کو توڑنا چاہا مگر انھوں نے جو نشاتِ جدیدہ پیدا کرنی چاہی، وہ اسلام کی نشاتِ جدیدہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ روحِ قرآنی اور اصولِ اسلامی سے بے بہرہ ہیں، ان کی فکر و نظر اسلامی نہیں ہے۔ اس لیے وہ نہ مسلمان کی حیثیت سے سوچ سکتے ہیں، نہ اسلامی طریق پر معلومات کو مرتب کر سکتے ہیں، نہ زندگی کے معاملات کو مسلمان کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔

ہمارا راستہ متاخرین اور متفرنجین دونوں سے الگ ہے۔ ہمیں ایک طرف روحِ قرآنی کو ٹھیک ٹھیک اپنے اندر جذب کرنا اور اپنی قوت فکر و نظر کو اصول اسلامی سے پوری طرح متحد کرنا ہے۔

دوسری طرف علم کی ان ترقیات اور احوال کے ان تغیرات کا پورا پورا جائزہ لینا ہے جو گذشتہ سات آٹھ سو برس کی مدت میں ہوئی ہیں۔ اور تیسری طرف صحیح اسلامی طریق پر افکار و معلومات کو مرتب اور قوانین حیات کو مدون کرنا ہے تاکہ اسلام پھر سے بالفعل ایک dynamic force بن جائے اور دنیا میں مقتدی بننے کے بجائے مقتدیٰ اور امام بن کر رہے۔

"یہ ایک Herculean task ہے۔ اول تو ہم اس کو اس طرح شروع کر رہے ہیں کہ ہم سے پہلے کوئی اس کے نشانات راہ چھوڑ کر نہیں گیا ہے۔ ہمیں خود ہی اپنی منزل مقصود کو پیش نظر رکھ کر راستہ بنانا اور اس پر چلنا ہے۔ دوسرے: یہ اتنا بڑا کام ہے کہ میری اور آپ کی اور ہم جیسے سیکڑوں آدمیوں کی پوری پوری زندگیاں بھی اس کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگر ہم یہ امید کریں کہ ہماری زندگی ہی میں اس کے پورے نتائج سامنے آجائیں گے، تو یہ غلط امید ہوگی۔ یہ کھجور کا درخت لگانا ہے، جو اس کو بوتا ہے، وہ اس کے پھل نہیں توڑ سکتا۔ ہم اس درخت کو لگائیں گے اور اپنے خون جگر سے اس کو سینچ کر چلے جائیں گے۔ ہمارے بعد دوسری نسل آئے گی اور شاید وہ بھی اس کے پھلوں سے پوری طرح لذت آشنا نہ ہو سکے گی۔ کم از کم دو تین پشتیں اس کے پورے نتائج ظاہر ہونے کے لیے درکار ہیں۔ لہٰذا ہمیں نتائج کے لیے بے صبر نہ ہونا چاہیے۔

"ہمارا کام یہ ہے کہ عمارت کا نقشہ ٹھیک ٹھیک (جیسا ٹھیک کہ ہم بنا سکتے ہیں) بنا دیں اور اس کی بنیادیں اٹھا کر نئی آنے والی نسل کو تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لیے تیار کر دیں۔ اس سے زیادہ غالباً ہم کچھ نہ کر سکیں گے"۔ (خطوط مودودی: ۲، ص ۷۰-۷۱)

علما سے مشورے اور استفادے کے حصول کی ضرورت اور اہمیت کے بھرپور اعتراف کے ساتھ وقت کی اصل ضرورت کے بیان کرنے میں کوئی مداہنت نہیں برتتے نہ لگی لپٹی رکھتے ہیں۔ ایک اور خط میں چودھری نیاز علی خاں ہی کو لکھتے ہیں:

"یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مولانا اشرف علی صاحب کے پاس آپ ہو آئے اور مطمئن آئے۔ ان کے علم و فضل اور تقویٰ کا میں خود بھی بہت احترام کرتا ہوں اور ہندوستان کے بہترین علما میں انھیں شمار کرتا ہوں۔ ان حضرات سے استفادہ کرنا اور ان کی ہدایات سے روشنی حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں ان سے قطع تعلق کا تو وہم بھی نہیں رکھتا۔ البتہ تجربہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس راستے پر ہم جانا چاہتے ہیں، اس میں یہ حضرات ہماری پیشوائی اور قیادت نہ کر سکیں گے، بلکہ ہمارے ساتھ بھی نہ چل سکیں گے"۔ (ایضاً، ص ۸۴)

مولانا مودودی پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں اور نصف صدی سے ان کی بوچھاڑ جاری ہے، ان میں سرفہرست ان کا یہ "جرم" ہے کہ انھوں نے اسلام کے لیے "تحریک" کا لفظ استعمال کیا۔ اس کا

جواب مولانا مناظر احسن گیلانی کے نام اپنے مکتوب میں اس طرح دیتے ہیں:

''تجدید اور تجدد کا اصولی فرق یہ ہے کہ تجدید ہر زمانے میں انھی حقائق اور انھی صداقتوں کو جو ازل سے چلی آرہی ہیں، اپنے زمانے کی زبان میں اپنے زمانے کی ذہنیتوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کر کے پیش کرتی ہے، اور تجدد اپنے زمانے کے فتنوں سے متاثر ہو کر ان حقیقتوں اور صداقتوں ہی میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر ان حضرات کے نزدیک میں تجدد کا مجرم ہوں تو براہ کرم مجھے تعین کے ساتھ بتائیں کہ کہاں میں نے دین کے جوہر میں تغیر کیا ہے۔ کسی جگہ یک سرمو تغیر بھی وہ بتا دیں اور میں اس سے توبہ نہ کروں تو یقیناً مجھ سے بڑا خاطی و ظالم کوئی نہ ہو گا۔ لیکن اگر ان کی ساری ناراضی صرف اس بات پر ہے کہ میں نے پرانی حقیقتوں کے لیے نئے الفاظ اور نئے طرز بیان اختیار کیے ہیں اور ان کو موجودہ زمانے کی ذہنیتوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کر کے پیش کیا ہے، تو مجھے بتایا جائے کہ تجدید دین کی کوشش کرنے والوں نے کس زمانے میں یہ جرم نہیں کیا ہے؟ اور کیا خود یہ حضرات معترضین اس کا ارتکاب نہیں کرتے رہے ہیں؟

''تحریک' کا لفظ جس مفہوم کے لیے میں استعمال کرتا ہوں، اس کے لیے کوئی دوسرا ایسا لفظ مجھے نہیں ملتا جو آج کل کے عام لوگوں کے ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دے۔ 'مذہب' ایک مدت سے صرف اس معنی کے لیے مخصوص ہو گیا ہے کہ چند عقائد اور چند عبادتوں اور رسموں کا مجموعہ جن کی پابندی سے آدمی روحانی ترقی یا نجات بعد الموت کا متوقع ہو۔ اسی معنی کے لحاظ سے آج کل کے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب ایک انفرادی چیز ہے، عابد اور معبود کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق ہے، اس کو اجتماعی معاملات اور ملکی انتظام سے کیا تعلق؟ اسلام کے لیے لفظ مذہب کا استعمال موجودہ دور کے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ یہ بھی اسی جنس مذاہب کا ایک فرد ہو گا۔ رہا 'دین' تو اسے بھی ایک مدت سے مذہب اور دھرم کا ہم معنی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ تاہم اگر دین کو اس کے وسیع معنی میں بھی استعمال کیا جائے تب بھی سننے والے کے ذہن میں اس سے صرف اتنی بات ہی آتی ہے کہ یہ پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور ہمہ گیر نظام ہے جو عقائد و افکار سے لے کر انفرادی و اجتماعی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک کا احاطہ کرتا ہے اور جس کا تعلق دنیا اور اس کے انتظام سے بھی اتنا ہی ہے جتنا حیات بعد الموت سے ہے۔ لیکن یہ بات کہ دین ایک نظام ہونے کی حیثیت سے دنیا کا انتظام خود اپنے زیر اقتدار لینے کا متقاضی ہے، اور اس کے ایک نظام ہونے کا فطری اقتضا یہی ہے کہ دوسرے نظاموں کو ہٹا کر یہ خود ان کی جگہ قائم ہو، اور اس وجہ سے دین کی پیروی قبول کرتے ہی آدمی پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ دوسرے نظاموں کے تسلط کو مٹانے اور اس نظام کو قائم کرنے کے لیے کوشش کرے، محض لفظ 'دین' سن کر آج کل کسی کے ذہن میں بھی نہیں آتی۔ اس مفہوم کو

موجودہ دور میں لفظ 'تحریک' اچھی طرح ادا کرتا ہے۔ اس وجہ سے میں اسلام کے لیے 'دین' کے ساتھ 'تحریک' کا لفظ بھی اکثر استعمال کرتا ہوں۔ نیز اس کوشش اور جدوجہد کے لیے بھی مجھے 'تحریک' ہی کی اصطلاح استعمال کرنی پڑتی ہے 'کیونکہ جہاد اور مجاہدہ کے الفاظ جو قرآن نے اس مفہوم کے لیے اختیار کیے تھے 'انحطاط کے دور میں ان کے معانی بالکل بدل کر رہ گئے ہیں۔ مجاہدہ کا لفظ سن کر آج کے لوگوں کا ذہن صوفیانہ ریاضات اور چلہ کشی کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور 'جہاد' بولیے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بس اب ایک لشکر مرتب ہو گا اور غنیم کے خلاف معرکہ قتال شروع ہو جائے گا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ 'تحریک' کے نام سے جو چیز میں نے پیش کی ہے ' آیا وہ دین اور جہاد فی سبیل اللہ ہی ہے یا کوئی اور چیز؟ اگر کوئی اور چیز ہے تو بلاشبہ میں مجرم ہوں ' لیکن اگر وہ دین اور جہاد ہی ہے تو محض اتنی بات پر بگڑ جانا کہ میں نے اس کے لیے نیا لفظ کیوں استعمال کیا 'کم از کم صاحب 'معارف' اور صاحب 'صدق' جیسے حضرات کے مرتبے سے تو بہت فروتر ہے"۔ (ایضاً 'ص ۲۷۷-۲۷۹)

مولانا مناظر احسن گیلانی کے نام اپنے مکتوب میں دور حاضر میں دعوت اسلامی کے کام اور اس کے مزاج اور تقاضوں پر گفتگو کرتے ہوئے اس دور کی ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی علمی بحثوں کو اس طرح کوزے میں بند کر دیتے ہیں:

"اصولاً دعوت الی اللہ کے کام کی آج بھی وہی نوعیت ہے جو پہلے تھی ' یعنی غیر اللہ کی ربوبیت و حاکمیت تسلیم کرنے سے علی الاعلان انکار اور صرف رب العالمین کی ربوبیت و حاکمیت تسلیم کرنے کی طرف دعوت عام۔ یہی ہم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ستیاگرہی نہیں ہیں ' جیل جانا ہمارا پروگرام نہیں ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ہم پکڑے ہی جائیں ' پیٹے ہی جائیں ' ریت پر گھسیٹے ہی جائیں۔ اگر کوئی اس دعوت میں ہماری مزاحمت نہ کرے اور حاکمیت غیر اللہ کے ابطال کو برداشت کر لے یا سیدھی طرح ہماری اس دعوت کو قبول کر لے تو چشم ماروشن و دل ماشاد۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اس چیز کو ٹھنڈے پیٹوں کبھی گوارا نہیں کیا گیا ہے ' اور نہ آج گوارا کیا جائے گا۔ جب مسلمان ہی یہ آواز سن کر بگڑ کھڑے ہوتے ہیں ' تو دوسروں سے ہم کیونکر توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اسے برداشت کر لیں گے۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اس دعوت کے بلند کرنے پر آج بھی وہی کچھ پیش آکر رہے گا جو کل مکہ میں پیش آیا تھا۔ اسی مشابہت کی بنا پر ہم اپنے موجودہ حال کو زمانہ ماقبل ہجرت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مگر آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ: "جب تم اسے مکی زندگی کہتے ہو تو پھر تمام حصامات سے وہی پروگرام رکھو جو مکہ میں تھا اور مدنیت کو اپنے پروگرام سے خارج کر دو"۔ یہ رائے اس لیے غیر صحیح ہے کہ مکہ میں تو سب کفار ہی کفار تھے ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل ابتدا سے دعوت کا آغاز فرمایا تھا اور جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے تھے ان پر رفتہ رفتہ تکالیف شرعیہ عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن یہاں

سارے کے سارے کفار ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمان بھی موجود ہیں۔ اسلام بتدریج نازل نہیں ہو رہا ہے بلکہ پورے کا پورا آچکا ہے اور مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہے۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص یا گروہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھے، وہ خود پورے اسلام پر عمل کرنے کے بجائے صرف اسی قدر تکالیف شرعیہ کا التزام کرے جتنی مکہ معظمہ میں اسلام قبول کرنے والوں پر عائد کی گئی تھی۔ لہٰذا ہمیں 'مکیت' کے ساتھ 'مدنیت' کو بھی لے کر چلنا ہو گا۔ غیر مسلمانوں کو تو ہم پہلے اسی چیز کی طرف دعوت دیں گے جس کی طرف انھیں مکہ میں بلایا گیا تھا، مگر جو مسلمان ہمارے ساتھ اس دعوت کے کام میں شریک ہوں گے، اور جو غیر مسلم اسلام قبول کر کے ہمارے ساتھ ملیں گے، ان کو تو اس پورے اسلام ہی کا التزام کرنا ہو گا جو قرآن اور سنت میں ملتا ہے۔ اگر دعوت دینے والے خود ہی اسلامی احکام کے ملتزم نہ ہوں تو دوسروں پر ان کی دعوت کا کیا خاک اثر پڑے گا"۔
(ایضاً، ص ۲۷۶-۲۷۷)

آج ہم ان بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ بنیادی کام اور عوامی کام میں سے کس کو ترجیح اور اولیت حاصل ہو؟ تربیت اور تیاری اور سیاسی جدوجہد اور عملی تحریک میں کیا نسبت ہو؟ نوجوانوں میں کام اور وسعت سے معیار کے تحلیل ہونے کا خطرہ ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی سوال نیا نہیں ہے۔ دیکھیے خود ۱۹۳۷ میں چودھری نیاز علی خاں کو ایک خط میں مولانا مودودی حیدر آباد دکن سے کیا لکھتے ہیں:

"میں آپ کے مشوروں کا بہت شکرگزار ہوں۔ وہ سب باتیں جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں، میرے پیش نظر ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے پہلے میری اسکیم یہی تھی کہ خاموشی کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ کر کام کے آدمی تیار کیے جائیں اور پھر ان سے کوئی بڑا کام لیا جائے۔ لیکن یہ کام دیر طلب ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ انقلاب سر پر آگیا ہے۔ اگر اس وقت مسلمانوں میں کوئی زندگی پیدا نہ کی گئی تو پوری جماعت ڈوب جائے گی اور جب پوری جماعت ڈوب گئی تو ہمارا اور آپ کا کہیں ٹھکانا ہی نہ ہو گا کہ کوئی تعمیری کام کر سکیں۔ ایک طرف تو یہ پہلو ہے، دوسری طرف یہ حقیقت بجائے خود قائم ہے کہ محض سطحی تحریک سے کوئی پائیدار فائدہ نہ ہو گا۔ تعمیری کام بہرحال ضروری ہے اور تعمیری کام یہی ہے کہ ایک باایمان اور فعال جماعت تیار کی جائے، جو پوری قوم کو بنانے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ وقت پہلے کام کا مطالبہ کر رہا ہے جس کے لیے فوری عمل کی ضرورت ہے، اور حکمت دوسرے کام کی متقاضی ہے جو تدریجی تعمیر چاہتا ہے۔ میں کئی مہینے سے اسی فکر میں مبتلا ہوں کہ کیا کروں۔ بالآخر اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں (اگرچہ حتمی طور پر نہیں) کہ مجھ کو یہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرنے چاہییں۔

”پہلے کام کے لیے میں مخلص، پرجوش اور باعمل نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہوں، جو ہماری قوم کے عوام میں جائے اور ان کے اندر بیداری پیدا کرے۔ اس کا مرکز لاہور یا شمالی ہند کا کوئی مناسب مقام ہوگا۔ رہا دوسرا کام تو اس کے لیے آپ کے ادارے کو مرکز بنایا جائے گا، اور یہاں ایک نہایت گہری اور پایدار بنیاد پر تعمیری کام کرنے کے لیے اہل علم کی ایک جماعت تیار کی جائے۔ میں ان دونوں کاموں سے اپنا تعلق رکھوں اور کسی ایسی جگہ ہجرت کر جاؤں جہاں سے یہ دونوں تحریکیں با آسانی چلائی جا سکیں۔ طبیعت کا میلان لاہور کی طرف ہے کیونکہ زندگی وہیں پائی جاتی ہے، مگر مجھے ابھی تک کوئی اندازہ نہیں کہ وہاں مجھے کتنی support حاصل ہو سکے گی“۔ (ایضاً، ص ۱۰۱-۱۰۲)

چودھری نیاز علی خاں کو ائمہ کی تربیت کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور امام کا جو تصور ان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ مولانا مودودی کے دعوتی کام اور اہداف کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

”امام اپنی مسجد کے حلقہ اثر میں اسلام کا نمایندہ ہے۔ اس کے اخلاق اور اس کی سیرت کو نہایت پاکیزہ ہونا چاہیے۔ ایک معمولی درجے کی دنائت یا ناشایستگی بھی اگر اس سے سرزد ہو تو غیروں کی نظر ہی میں نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی نظر میں بھی اسلام کی وقعت گر جاتی ہے، حتیٰ کہ لوگوں کے ایمان تک خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کو اپنی زندگی ایسی بنانی چاہیے کہ گویا وہ زندہ اور چلتا پھرتا اسلام ہے۔ دلوں میں اس کی عزت اور محبت جاگزیں ہونی چاہیے، اور اس کی شخصیت میں ایسی کشش ہونی چاہیے کہ وہ اپنی بستی کا مرکز بن جائے اور اپنی مقناطیسیت سے مسجد کو بھی اسلامی آبادی کا مرکز بنا دے۔ امام کا خوش آواز ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ قرآن کو دل کش طریق سے پڑھ سکے۔ اس میں خطابت کی قابلیت بھی ضروری ہے، تاکہ جمعہ کا خطبہ برجستہ دے سکے۔ اس کا مطالعہ کافی وسیع ہونا چاہیے۔ نہ صرف احکام اسلامی سے خوب واقف ہو، بلکہ عام معلومات بھی اسے حاصل ہوں اور ایک حد تک لیڈرشپ کی اچھی صلاحیتیں اس کے اندر موجود ہوں“۔ (ایضاً، ص ۷۲)

آج ہم نوجوانوں میں کام کے لیے خطوط کار مرتب کرنے میں متردد ہیں اور ”کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے“ کے چکر میں ہیں۔ مولانا مودودی نے ۱۹۳۹ کے اپنے اس خط میں (بنام سید محمد نواز) ادارہ دارالاسلام سے تعلق رکھنے والوں کو تین مدارج میں تقسیم کیا ہے۔ تیسرے درجے کے لیے مجاہدین اسلام کا جو نقشہ عمل اس میں تجویز کیا گیا ہے، وہ آج بھی شباب ملی کے لیے جادہ راہ بن سکتا ہے

”ادارۂ دارالاسلام“ کے دستور العمل میں ہم نے تحریک سے تعلق رکھنے والوں کو دو مدارج میں

تقسیم کیا ہے:

(۱) وہ جو بالکلیہ اپنے آپ کو دارالاسلام کی تحریک کے لیے وقف کر دیں اور ڈسپلن کی پوری پابندی قبول کریں۔

(۲) وہ جو محض معاون ہوں۔

"اب اگر آپ چاہتے ہیں تو تیسرا درجہ ان عام لوگوں کے لیے رکھا جا سکتا ہے جو اوپر کے مدارج میں نہ آسکتے ہوں۔ لیکن پہلے اس کام کو بے ضابطہ طور پر امتحاناً کر کے دیکھیے۔ بعد میں دستور العمل کے اندر اس کا اضافہ کر دیا جائے گا، بشرطیکہ تجربہ کامیاب ہو۔

"اس تجربے کی صورت یہ ہوگی کہ جہاں پانچ آدمی آپ کو ادارے کی رکنیت کے قابل مل جائیں وہاں ان سے عہد لے کر ادارے کی شاخ قائم کیجیے اور ان پانچ میں سے جمہوری طریق پر ایک کو صدر منتخب کرائیے۔ پھر اس صدر کے تحت جیش مرتب کیجیے۔ جیش کا نام "مجاہدین اسلام" مناسب ہے۔ اس جیش کے ارکان ادارے میں شامل نہ ہوں گے، مگر صدر ادارے کے ماتحت منظم ہوں گے۔ ان لوگوں کو پریڈ کرانے کے ماسوا حسب ذیل امور کی پابندی کرنی ہوگی:

(۱) پانچ وقت کی نماز پوری پابندی کے ساتھ اور حتی الامکان جماعت کے ساتھ۔

(۲) دیگر ارکان اسلام کی پابندی۔

(۳) محرمات شرعیہ سے اجتناب۔

(۴) قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنا اور دین اسلام سے واقفیت پیدا کرنا۔

(۵) عام مسلمانوں کے ساتھ اور غیر مسلموں کے ساتھ پوری خوش خلقی کے ساتھ پیش آنا اور ہر وقت اپنے آپ کو اسلام کا نمایندہ سمجھ کر لوگوں سے معاملہ کرنا۔

"ان پانچ امور میں ارکان جیش کی زندگی پر نگرانی رکھنا صدر کا کام ہوگا۔ صدر کو ارکان جیش میں یہ اسپرٹ پیدا کرنی چاہیے کہ جب کبھی کسی شخص سے نافرمانی کا ارتکاب ہو تو وہ پوری سچائی کے ساتھ آکر اس کا اعتراف کرے اور اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کرے۔ سزا میں صدر کو غایت درجہ اعتدال ملحوظ رکھنا چاہیے، اور یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کو تکلیف دینا یا ان سے انتقام لینا نہیں ہے، بلکہ ان کے نفس کا تزکیہ کرنا ہے۔ نیز یہ کوشش کرنی چاہیے کہ یہ لوگ کلمہ طیبہ کی روح اور نماز کی روح سے واقف ہوں، اور ہر مرتبہ جب نماز پڑھیں تو اپنے نفس کا احتساب کریں اور اپنے آپ کو 'ذمہ دار' سمجھتے ہوئے نماز ادا کریں۔

"ارکان ادارہ کا یہ کام ہوگا کہ جیش کے ارکان میں سے جو لوگ ان پڑھ ہوں، ان کو تعلیم دیں۔ نیز ارکان جیش کے اندر باہمی معاونت، ہمدردی اور ایک دوسرے کے معاشی حالات میں

مساعدت کی اسپرٹ پیدا کرنی ہوگی۔

یہ چھ مہینے کا کورس ہے۔ اس مدت میں ارکان جیش کی شخصی زندگی کی اصلاح ہو جانی چاہیے۔ ان کو اسلام سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے اور ان میں سے ہر شخص کو لکھنا پڑھنا آجانا چاہیے۔

اس ٹریننگ کے بعد ارکان جیش سے جو کام لیا جائے اس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

۱۔ ان کو پانچ پانچ آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر ٹکڑی پر ایک افسر مقرر کیا جائے۔

۲۔ ہر ٹکڑی سے مہینے میں تین، چار یا سات دن (جیسی کہ ان کی سہولت ہو) مختلف اوقات میں (یعنی سب سے ایک ہی وقت میں نہیں بلکہ الگ الگ وقتوں میں) مانگے جائیں تاکہ وہ دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیں۔

۳۔ اولاً یہ لوگ اپنے اطراف و نواح کی مسلمان آبادیوں کو لیں اور نہایت محبت اور نرمی کے ساتھ انھیں اسلام کی تعلیمات سمجھائیں، ان کے اندر دین کی سمجھ پیدا کریں اور جتنے آدمی ان میں 'کام کے' مل سکیں، انھیں اپنے جیش میں بھرتی کرلیں۔ (نوٹ: اس تبلیغ میں پوری کوشش کی جائے کہ لوگوں کے تعصبات جاہلیت پر فوراً حملہ نہ ہو۔ ابتداً صرف کلمہ طیبہ کے معنی سمجھانے، نماز اور روزہ کی طرف راغب کرنے اور صریح محرمات سے روکنے پر زور دینا چاہیے۔ بعد میں نہایت تدریج کے ساتھ رسوم جاہلیت کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے)۔

۴۔ مسلمانوں کے اندر سے قبائلی تفریق، اور نسلی عصبیت کو مٹایا جائے۔ نیز جہاں جہاں مسلمانوں میں چھوت چھات پائی جاتی ہے، یا کم درجے کی قوموں کے ساتھ تذلیل کا برتاؤ کیا جاتا ہے، وہاں اس کی اصلاح کی جائے (لعنت ملامت سے نہیں بلکہ اسلام کی جمہوریت اور مساوات کی تعلیم سے)۔ کوشش کی جائے کہ مسلمان قبائل باہم شادی بیاہ کرنے لگیں اور سب مسلمان ایک دوسرے کو برابر کا بھائی سمجھیں اور کوئی کسی کو ادنیٰ یا ذلیل نہ سمجھے۔

۵۔ سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ جہاں مسلمانوں کے اختلافات ہوں، وہاں بڑی نرمی اور محبت کے ساتھ انھیں دور کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ یہ قومیں مسلمانوں سے قریب تر ہوں اور مسلمان اپنے اخلاق اور حسن معاملت سے ان کو موہنے لگیں۔

۶۔ غیر مسلم قوموں کو براہ راست تبلیغ کا مخاطب نہ بنایا جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے indirect طریقوں سے ان کو اسلام کی بلند تعلیمات اور اسلامی جمہوریت و مساوات اور اسلامی حسن اخلاق سے متاثر کیا جائے۔ یہ تو وہ کام ہیں جو ارکان جیش سے آپ کو لینے ہیں اور اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے تبلیغی دوروں میں یہ لوگ پورے فوجی نظم اور ڈسپلن کے ساتھ کام کریں۔

"رہے ادارۂ دار الاسلام کے ارکان، تو ان کا کام یہ ہے کہ ارکان جیش کی تعلیم و تربیت، اور تبلیغ و دعوت کے کام میں ان کی رہنمائی کریں، اور دورے کر کے ان کے کام کی نگرانی کرتے رہیں، اور جہاں ان سے غلطیاں ہوں، وہاں ان کی اصلاح کریں۔ یہ خیال ارکان ادارہ کو بھی رہنا چاہیے اور ارکان جیش کے دل میں بھی بٹھا دینا چاہیے، کہ ان کی فوجی تنظیم ہندوؤں سے یا سکھوں سے لڑنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف باضابطہ کام کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ دراصل ان کی تحریک کا منشا اسلام کی superior moral force سے ہندوستان کو از سرنو فتح کرنا ہے۔ یہی نقش آپ کے عمل سے غیر مسلموں کے دل پر بھی بیٹھنا چاہیے تاکہ انھیں جوابی تنظیم کا خیال پیدا نہ ہو۔ میرے اس خط کو محفوظ رکھیے۔ میرے پاس اس وقت کوئی آدمی ایسا نہیں ہے کہ میں اس کی نقل کرا کے اپنے پاس رکھ سکوں"۔ (ایضاً، ص ۲۱۴-۲۱۷)

یہ بات اہم ہے کہ، مولانا کے خطوط کے سارے ذخیرہ میں غالباً صرف یہ خط ایسا ہے جس میں مولانا نے اسے محفوظ رکھنے اور اس کی نقل حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

خطوط مودودی کے اس مجموعے میں ایک خط کسی نامعلوم مستفسر کے نام ہے، جس نے رزق حلال اور وکالت کے پیشے کے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ خط جہاں مکتوب نگار کی شخصیت کی یک رنگی اور اس کے تصور دین کا آئینہ دار ہے وہیں دعوت اور نصیحت کا بھی ایک شاہکار ہے۔ خط پورا ہی پڑھنے کے لائق ہے اور دینی ادب کے ہر مجموعے میں شمولیت کا حق دار ہے۔ اس میں اصابت فکر کے ساتھ اصلاح کی جو تڑپ ہے وہ داعی ہی کا حصہ ہے:

"عنایت نامہ مورخہ ۲۸ مارچ وصول ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں، جو کسب معیشت کے طریقوں میں حرام اور حلال کی تمیز کرنا چاہتے ہیں، ورنہ مادہ پرستی جس طرح ذہنیتوں پر چھائی ہوئی ہے، اس کا اثر تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ، کیا جدید تعلیم یافتہ اور کیا قدیم تعلیم یافتہ، سب کے پیش نظر جلب منفعت اور کسب زر ہے، اور جو طریقہ زیادہ پر منفعت نظر آتا ہے، اس میں حرام و حلال کی تمیز کرنے کو حماقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وکالت کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ حقیقت سے کچھ کم ہی ہے، زیادہ نہیں ہے، وکیل اگر اس نیت سے اور اس شرط کے ساتھ کام کرے کہ حق دار کو اس کا حق دلوانے میں قانونی مدد کرے گا تو اس کا پیشہ جائز ہے اور اگر اس نیت سے بیٹھے کہ جو شخص اس کو پیسہ دے گا، خواہ وہ برسر حق ہو، یا برسر ظلم، بہرحال یہ اس کی مقصد بر آری میں مدد دے گا، تو یہ اس کے پیشے کو اصولاً حرام کر دے گا۔ لیکن تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وہ اصل الاصول ہے، جو تمام دنیاوی معاملات میں قرآن نے پیش کیا ہے اور اس کی خلاف ورزی بہرحال ایک معصیت ہے۔

اب اس معصیت کی راہ اختیار کر کے آدمی جس جس درجے کے مرتکبین حرام کے ساتھ تعاون کرے گا، اسی درجے کے حرام کا گویا وہ خود مرتکب ہو گا۔ اگر آپ نے سود خوار کو سود دلوایا تو گویا خود سود خواری کے مجرم ہوئے۔ اگر زانی کو سزا سے بچایا تو خود زنا میں معین ہوئے۔ اگر غاصب کو کسی جائز ملکیت پر قبضہ دلایا تو خود غصب میں شریک ہوئے۔ وقس علی ھذا۔

"آپ کی روح مجھے سعید معلوم ہوئی ہے، اس لیے میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔ اس پر آپ غور کریں گے تو آپ کو اپنی آیندہ زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

"انسان کے لیے دنیا میں دو راستے ہیں۔ اگر وہ آخرت پر اعتقاد نہیں رکھتا اور خدا کے سامنے حاضر ہونے اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال کی جواب دہی کرنے کا اس کو کوئی خیال نہیں اور کامیابی اور ناکامی کا معیار اس کی نگاہ میں صرف اس دنیا کی خوش حالی و بدحالی ہے تو اس کو حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی اخلاقی و مذہبی قیود کو بالکل نظرانداز کر دینا چاہیے اور پوری تندہی کے ساتھ دولت دنیا سمیٹنے اور اس سے لذت و عیش کے سامان فراہم کرنے میں لگ جانا چاہیے۔ اس کے لیے حرام وہ ہے جو حصول منفعت اور طلب لذلت میں مانع ہو، اور حلال وہ ہے جو اس میں معاون ہو۔ اور اگر وہ آخرت پر یقین رکھتا ہے اور خدا کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ خدا کی آخری عدالت میں وہ کم از کم من حیث المجموع نیکوکار ٹھیرے اور ناکامی یہ ہے کہ آخری balance sheet میں وہ خائب و خاسر (bankrupt) نکلے، تو پھر دنیوی زندگی میں اسے اپنے نقطہ نظر میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اس کو پھر اپنی کامیابی و ناکامی کا اندازہ اس لحاظ سے نہ کرنا چاہیے کہ اس نے کس قدر خوش حالی حاصل کی، کیسے کپڑے پہنے، کیسے مکان میں رہا، کیسا کھانا کھایا اور کس قدر اسباب تعیش فراہم کیے۔ بلکہ اس لحاظ سے اندازہ کرنا چاہیے کہ اپنے واجبات کو ادا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا، لوگوں کے حقوق اور خدا کے حقوق سے کہاں تک سبکدوش ہوا، اور افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی بال سے زیادہ باریک راہ پر قائم رہنے میں کہاں تک کامیابی اس نے حاصل کی۔ زندگی کا یہ نقطہ نظر جب وہ اختیار کرے گا تو پیوند لگے ہوئے کپڑوں اور سوکھے ٹکڑوں میں اس کو وہ اطمینان قلب نصیب ہو گا جو حرام کھانے والوں کو حریر و دیبا پہننے اور الوان نعمت کھانے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔

"برادرم، دنیا میں خدا کا رزق فراواں ہے۔ رزق بجائے خود طیب و طاہر ہی ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی پسند پر موقوف ہے کہ حرام طریقے سے اس کو حاصل کرے یا حلال طریقے سے۔ یہ چور کی اپنی دوں ہمتی ہے کہ جو پاک روٹی اس کو پاک ذریعے سے مل سکتی تھی، اس نے ناپاک ذریعے سے اس کو نجس کر کے کھایا۔ دنیا میں پاک ذرائع بھی اس کثرت سے موجود ہیں جس کثرت سے ناپاک ذرائع

موجود ہیں۔ اگر آپ اپنی نیت کو پاک کرلیں، اور اتنا عزم اپنے اندر پیدا کرلیں کہ اپنے ضمیر کے خلاف کوئی temptation آپ کے قدم میں لغزش پیدا نہ کر سکتا ہو، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ناپاک ذرائع زیادہ مشکل اور پاک ذرائع زیادہ آسان ہیں۔ اور اگر نیت میں ناپاکی موجود ہو یا عزم موجود نہ ہو، تو پھر ناپاک ذریعہ آسان اور ہر پاک ذریعہ مشکل نظر آئے گا۔ نیک نیت اور سچے عزم والے آدمی کے لیے سڑک پر بیٹھ کر جوتی گانٹھنا آسان اور لوگوں کے حقوق مار کر وڈپٹی بننا دشوار ہے۔ بخلاف اس کے بدنیت اور کم حوصلہ آدمی کو رزق حرام کے دریا بہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور رزق حلال تلاش کرنا اسے جوئے شیر سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔

"یہ ہے اصلی صورت حالات، اب آپ، لوگوں سے مشورہ کرنے اور ان کی مختلف آوازوں پر کان دھرنے کے بجائے صرف اپنے دل کی طرف نگاہ کیجیے، اور اس کو ٹٹول کر دیکھیے کہ اس کا میلان کس طرف ہے اور پھر اگر وہ اسلامی نقطہ نظر کی طرف مائل ہو تو یہ دیکھیے کہ آیا اس میں اتنا عزم بھی موجود ہے کہ وہ رزق حلال کی ایک نان جویں کو رزق حرام کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھے گا۔ اس امتحان میں اگر آپ کا قلب پورا اترے تو مسلمان کی زندگی اختیار کیجیے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً آپ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے گا اور اگر اس امتحان میں آپ کو محسوس ہو کہ آپ کا قلب بودا ہے تو پھر ٹھیٹھ مادہ پرست بن جایئے اور خدا و آخرت کا خیال دل سے قطعی نکال دیجیے، تاکہ کم از کم دوسرے ہی راستے میں آپ انتہا کو پہنچ سکیں۔ بیچ کے مقام پر ٹھیرنے کا میں آپ کو کبھی مشورہ نہ دوں گا کیونکہ جو شخص آدھا ادھر اور آدھا ادھر ہوتا ہے وہ دوہرے نقصان میں ہے، نہ مسلمان ہی کی حیثیت سے کامیاب اور نہ مادہ پرست ہی کی حیثیت سے کامیاب"۔ (ایضاً، ص ۱۹۳-۱۹۶)

جناب آغا شورش کاشمیری کو نئی سنٹرل جیل، ملتان سے اپریل ۱۹۵۰ کے اپنے ایک خط میں بڑے لطیف لیکن طنز کی پوری کاٹ کے ساتھ ایک بے ہودہ الزام کے بارے میں استفسار کرنے پر لکھتے ہیں:

"برادرم، میں اس وقت ایسی پوزیشن میں ہوں کہ اپنے خلاف کسی الزام کی تردید کرنا تو درکنار، اکثر حالات میں یہ جاننا بھی میرے لیے مشکل ہے کہ باہر کیا الزام مجھ پر لگایا جا رہا ہے۔ یہ ایک نادر موقع ہے کہ جس کے لیے بھی مجھ پر حملہ آور ہونا مفید ہو سکتا ہو، اس کو ضرور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انسان کا گوشت ویسے ہی ایک لذیذ چیز ہے۔ پھر جب کہ وہ مفت بٹ رہا ہو تو ہمارے موجودہ اخلاقی ماحول میں بھلا ایسے زاہد کتنے نکل آئیں گے جو اس سے متمتع ہونے میں تامل کر جائیں۔

"صحرائی صاحب نے تو جو کچھ کیا اس کا مجھے کوئی رنج نہیں، کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے اور جانتے بھی ہوں تو ان کے کرنے کا کام وہی ہے جو انھوں نے کیا۔ مگر آپ نے جو مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا تو نے

پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار کیا اور کیا تو نے قائداعظم مرحوم کو گالیاں دیں؟ اس سے فی الواقع مجھے بڑی اذیت ہوئی 'کیونکہ آپ سے میری توقعات کچھ اور تھیں۔ برادر عزیز! کیا اب کوئی ذلیل سے ذلیل بہتان بھی میرے مرتبے سے اتنا فروتر نہیں رہا کہ آپ اسے سن کر سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ کہہ سکیں اور مجھ سے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں؟ اور بالفرض اگر تحقیق کرنا ضروری ہی تھا تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی اجنبی اور غیر معروف آدمی تو نہیں ہوں۔ کم و بیش تیس سال سے پبلک لائف میں ہوں۔ برسوں اخبار نویسی کر چکا ہوں۔ سترہ اٹھارہ برس سے 'ترجمان القرآن' نکال رہا ہوں۔ کتابوں اور رسالوں کی شکل میں میرے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے موجود ہیں جن کو بلا مبالغہ لاکھوں آدمی پڑھ چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں ہزارہا آدمی ایسے موجود ہیں جنھوں نے اپنے کانوں سے میری تقریریں سنی ہیں۔ ہزاروں آدمی ذاتی طور پر میرے جاننے والے موجود ہیں۔ خود شہر لاہور میں برسوں رہ چکا ہوں۔ آپ نے کیوں نہ پبلک میں اعلان کیا کہ جو شخص ابوالاعلیٰ کو ایک بدزبان اور یاوہ گو انسان کی حیثیت سے جانتا ہو' یا جس نے اس کو کبھی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن و بدخواہ کی حیثیت سے جانا ہو وہ اپنی شہادت پیش کرے؟ آپ نے کیوں نہ میرے نئے اور پرانے ہمسایوں سے پوچھا کہ انھوں نے کبھی کوئی گالی یا بیہودہ بات میری زبان سے سنی ہے؟ آپ نے کیوں نہ میرے ذاتی ملازموں سے پوچھا کہ میں نے کبھی ان کو سخت سست کہا ہے؟ نہیں' بلکہ جو لوگ وقتاً" فوقتاً" مجھ کو گالیاں دیتے رہے ہیں اور آج بھی گالیوں سے نواز رہے ہیں' آپ نے انھی سے قسم دے کر پوچھ لیا ہوتا کہ کبھی میں نے بھی ان کی گالی کا جواب گالی سے دیا ہے؟ یہ ساری شہادتیں اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہوتیں تو البتہ آپ حق بجانب تھے کہ مجھ سے دریافت فرماتے۔'

'پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار' اور وہ بھی میری زبان سے؟ سبحان اللہ! میرے عزیز' تھوڑی دیر کے لیے دین و ملت کے سوال کو بھی نظرانداز کر دیجیے۔ خالص مادی نقطہ نظر ہی سے دیکھیے تو بھلا یہ کوئی عقل میں آنے کی بات ہے کہ جو شخص خود اپنے بال بچوں سمیت اس کشتی میں سوار ہے وہ اس میں چھید کرے گا؟ کیا وہ خود یہ چاہے گا کہ اس کا اور اس کی بیوی اور بیٹیوں اور بچوں کا وہی حشر ہو جو اس کی آنکھیں مشرقی پنجاب میں اپنی قوم کی بہنوں اور بیٹیوں کا دیکھ چکی ہیں؟ اس قسم کا عجیب سوال مجھ سے کرنے کے بجائے آپ نے جیل کے ڈاکٹر سے پوچھا ہوتا کہ ابوالاعلیٰ اس قید کے زمانے میں کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ اگر میں عقل و خرد سے محروم نہیں ہوں تو کیا غیرت' حمیت' شرافت' سب آپ ہی لوگوں کے حصہ میں آگئی ہے؟ میرے اندر اس کا شائبہ بھی نہیں رہا؟''

(ایضاً' ص ۵۲ ۳۔ ۵۴ ۳)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک آدھ مقام پر صیغہ واحد استعمال کرنے پر محمد اشرف صاحب نے گرفت کی۔ اس کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں:

"ان چند فقروں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چونکہ صیغہ واحد غائب استعمال ہوا ہے، تو آپ نے بس یہ سمجھ لیا کہ میں ہمیشہ آنحضورؐ کے لیے یہی صیغہ استعمال کرتا ہوں اور اس کے بعد آپ نے یہ بھی فیصلہ کر دیا کہ واحد صیغے کا استعمال بے ادبی و گستاخی ہے، حالانکہ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ میری تحریروں کا کچھ مزید مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بالعموم میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جمع ہی کا صیغہ استعمال کرتا ہوں۔ البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ بعض اوقات ادبی زبان اور اسلوب بیان کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے صیغہ واحد بھی استعمال کیا ہے اور انسان کی نیت ہی میں فتور نہ ہو تو صیغہ واحد بھی ادب و احترام کے منافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر کس کا احترام و اکرام واجب ہو گا، مگر اس کے لیے ہم واحد ہی کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کا تعلق ہے، آپؐ کے متعلق ہماری اردو زبان کے علما و ادبا کے کلام میں صیغہ واحد کی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں۔ آپ نے چونکہ بعض شعرا کے اشعار درج کیے جن میں بارگاہ نبویؐ میں ہدیہ عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس لیے میں آپ کے سامنے چند ایسے اشعار رکھتا ہوں جن میں صیغہ واحد مستعمل ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
(مولانا حالی)

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
(مولانا ظفر علی خاں)

کرم اے شہ عرب و عجم، کہ کھڑے ہیں منتظر کرم!
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری
(اقبال)

"آپ خود بتائیں کہ یہ اشعار کیا محبت و عقیدت سے مملو اور لبریز نہیں ہیں، حالانکہ ان میں صیغہ واحد ہی آیا ہے؟
آپ نے یہ بجا طور پر لکھا ہے کہ آپ کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے، بلکہ جس فعل کو غلط سمجھا، لکھ دیا۔ میری جوابی گزارش بھی یہی ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا مقصد بھی بحث کو بڑھانا نہیں۔ بس میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک مسلمان بھائی بلاوجہ بدگمانی کا شکار نہ رہے اور ایک ایسے مسلمان بھائی کو توہین رسالت" کا مرتکب نہ قرار دے جسے ختم نبوت کے تحفظ و اثبات اور ایک متنبی کاذب کے ابطال کی خاطر پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اس لیے اپنی حد تک اپنے اوپر غلط الزام رفع کرنے کی سعی کر دی۔ و اللہ اعلم بالصواب! (ایضاً، ص ۴۸۰-۴۸۱)
اور اخیر میں مولانا محترم کا ایک یادگار ادبی جملہ جس کا مخاطب خود یہ مضمون نگار ہی ہے۔ اس کا لطف اس وقت بھی لیا تھا جب یہ خط طلب کے بغیر مولانا کی کمال عنایت سے چراغ راہ کی خصوصی اشاعت نمبر (سوشلزم نمبر) پر مولانا کے تبصرہ کے طور پر موصول ہوا تھا اور آج بھی اس کی لذت اور ادبی لطافت میں بھی محسوس کرتا ہوں اور قارئین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔
"آپ کا سوشلزم نمبر' میں نے بغور پڑھا۔ آپ کی محنت قابل داد اور طباعت کے معاملہ میں شدید تساہل قابل فریاد ہے"۔ (ایضاً، ص ۴۹۲)

مضمون کچھ لمبا ہو گیا، لیکن میں نے مولانا مودودی کے خطوط کی جو جھلکیاں آپ کو دکھائی ہیں اور اس طرح جو وقت ہم نے مولانا کی صحبت میں گزارا ہے وہ کم از کم میرے لیے تو فکر و نظر کی روشنی اور جذبات و احساسات کے تزکیے کا بڑا سامان لیے ہوئے ہے اور سب سے بڑھ کر دعوت اسلامی اور تحریک حق کی سربلندی کی جدوجہد کے لیے تازیانہ شوق کی حیثیت رکھتا ہے ؎

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس امر کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی کہ برادران عزیز رفیع الدین ہاشمی اور سلیم منصور خالد نے یہ مجموعہ بڑی محنت اور بڑے حسن ذوق سے مرتب کیا ہے۔ صحت کتابت اور حسن طباعت کے باب میں بھی اس مجموعے کو معیاری کہا جا سکتا ہے۔ شخصیات و واقعات کے بارے میں تحقیق کا بھی حق ادا کیا گیا ہے۔ کتابیات بھی بڑی مفید معلومات کی حامل ہیں۔ بس کمی اگر رہ گئی ہے تو وہ یہ کہ اتنے قیمتی مجموعے میں ایک مفصل اشاریہ ضرور ہونا چاہیے تھا، تاکہ موضوعات کی تلاش میں سہولت ہوتی اور اس مجموعے کی افادیت دوچند ہو جاتی۔
توقع ہے کہ مرتبین مولانا مرحوم کے مزید خطوط کی تلاش اسی ذوق و شوق سے جاری رکھیں گے

اور تیسری جلد کے لیے بارہ برس کی بن باس کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ خطوط مودودی کی دونوں جلدیں، جن کی تزئین و ترتیب کی سعادت انھیں حاصل ہوئی ہے، وہ علمی، تحریکی اور ادبی لٹریچر میں بیش قیمت اضافہ ہیں اور ان کے پڑھنے سے انسان مولانا مودودی ہی سے قریب نہیں آتا خود مرتبین سے بھی ایک گونہ قربت محسوس کرتا ہے--- شاید کسی ایسی ہی کیفیت کے بارے میں کہا گیا ہے: ؎

وہ تو وہ ہیں، تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

(خطوط مودودی"، دوم کے اس مطالعے کی پہلی اور دوسری اقساط ماہ مئی اور جون کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں)

یورپ اور اسلامی "دہشت گردی"

مسلم سجاد

''اسلام اور مغرب'' پر مغرب کے اخبارات میں ایسی تحریریں بھی آجاتی ہیں جو کسی نامہ نگار کے روشن ضمیر کی آواز ہوتی ہیں۔ اسلامی دہشت گردی کے بارے میں امریکی پالیسی پر یورپ کے مفادات کے حوالے سے دی انڈی پنڈنٹ (یکم اگست ۹۶) میں رابرٹ فسک (Robert Fisk) کا مضمون (Burying the Crusaders sword) مطالعہ کے لائق ہے' ہم اس سے ماخوذ یہ تحریر پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک موقر یورپی اخبار' ایک مسلم عالم دین کو ہشت پا عفریت کے روپ میں پیش کرے جس کی عبا سے پنجے نکل کر پھیل رہے ہوں اور ساتھ کے مضمون کا عنوان ہو: اسلامی گینگرین (gangerene)۔ لیکن یہی ۹ مارچ کو فرانس کے روزنامے لی مانڈے نے کیا۔ کارٹون رونالڈ سیرلے نے بنایا تھا اور مضمون مارسیل گولڈ سٹائین کا تھا جو فرانس میں یہودی اداروں کی کونسل کا نائب صدر رہے۔ ابھی حال ہی میں امریکہ میں ٹرانس ورلڈ ایرلائنز کا جو طیارہ تباہ ہوا ہے' اس کے بارے میں ایک سیکورٹی کے ماہر نے کہا: ایران کی ہدایت پر سیکڑوں جنونی جنت میں اپنی منتظر حوروں کو رگیدتے ہوئے مشرق وسطیٰ سے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ بات بالکل سنجیدگی سے گذشتہ جمعرات کے یروشلم پوسٹ میں نقل کی گئی جس میں دو مضمون نگاروں نے بطور امر واقعہ بیان کیا کہ ایرانیوں نے جہاز میں بم رکھا تھا۔

نفرت کی یہ زبان اور دہشت گردی اور جنون کا یہ تذکرہ محض صحافیانہ کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا تصور کریں کہ اگر ہیبرون میں ایک اسرائیلی کے ہاتھوں ۲۹ فلسطینیوں کے قتل کے بعد' اگر لی مانڈے میں یہودی گینگرین کے عنوان سے مضمون شائع ہوتا تو ہمیں—— بالکل جائز طور پر—— کتنا برا لگتا! حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کے بے گناہوں کو خون کا غسل دینے کے اس فعل کو کسی نے دہشت گردی تک قرار نہیں دیا' شاید اس لیے کہ یہ وہ دہشت گردی نہیں ہے جس کے خلاف امریکہ اور یورپ کو مہم چلانے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

مغرب مشرق وسطیٰ میں اپنے حقیقی یا فرضی دشمنوں کے خلاف جو زبان استعمال کر رہا ہے، وہ یورپ کے لیے خطرہ بنتی جا رہی ہے۔ امریکی اور اسرائیلی ٹیلی ویژن اور پریس میں غصہ اور نفرت کے اظہار کے لیے اسلامی دہشت گردی 'ایک روز مرہ کا لفظ بن گیا ہے۔ ہر دو جملوں کے درمیان یہ آ جاتا ہے اور اسے استعمال کرتے ہوئے مذہب یا تاریخ کا لحاظ کرنے یا کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شرم الشیخ میں سربراہ کانفرنس کے موقع پر' اور ابھی پچھلے ہفتے پھر' معلوم ہوتا ہے کہ صدر کلنٹن نے جیسے دوسری صلیبی جنگوں کا آغاز کر دیا ہے۔

بلاشبہ جب موت کے متمنی مجاہد' مغرب یا اسرائیل میں شہریوں کو ہلاک کرتے ہیں تو مغرب اور اسرائیل کے لاکھوں عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ اسلامی دہشت گردی ان کی دشمن ہے۔ شاید فدائی یہی بتانا چاہتے بھی ہوں' لیکن دوسری طرف جب بوسنیا کے سربوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کو ذبح کیا اور عصمت دری کر کر کے علاقوں کی فتح کا اعلان کیا تو کسی نے ان کو عیسائی دہشت گردی کی علامت قرار نہیں دیا۔ لیکن یہ دوسری کہانی ہے۔

تشدد آمیز زبان کا استعمال پورے مغرب میں عام ہو گیا ہے اور اب بعض یورپی حکومتیں اس پر پریشانی محسوس کر رہی ہیں۔ کم سے کم ایک یورپی ملک کے وزیر خارجہ نے اپنے رفقا کار کو یہ تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا کہ دہشت گردی کو جنون ہی نہیں' بے انصافی بھی جنم دیتی ہے۔ دہشت گردی کا لیبل لگا کر دراصل بے انصافی پر سوچ سمجھ کر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اب جب کہ اسرائیلی انتخابات میں لیکوڈ پارٹی کی فتح نے امریکی اسرائیلی امن منصوبے کو زمین بوس کر دیا ہے' یورپ کے لیے نام نہاد اسلامی دہشت گردی کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کی جنگ میں ساتھ دینا آخری ترجیح بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی ایک سیدھی اور صاف وجہ ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے مفادلت واضح اور ظاہر ہیں: اسرائیل اور تیل۔ یورپ کے بھی مفادلت ہیں لیکن ایک اور بات ان سے زیادہ اہم ہے۔ مشرق وسطیٰ کی قومیں ہماری پڑوسی ہیں۔ انھیں کبھی بھی امریکہ کا پڑوسی نہیں بننا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمارے پڑوسی رہیں گے۔

اس حقیقت کے احساس سے' یورپ مشرق وسطیٰ میں نسبتاً مختلف پالیسی کی طرف آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔ یہ امریکہ کی مخالف پالیسی نہیں ہے لیکن امریکہ کو اشتعال دلا سکتی ہے۔ گذشتہ سال صدر کلنٹن نے نیویارک میں یہودیوں کے ایک اجتماع میں ایران پر جن پابندیوں کا اعلان کیا' یورپی ممالک نے اس میں ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ یورپی ممالک لڑائی کے بجائے بات چیت کی پالیسی اختیار کر رہے ہیں۔ گذشتہ اپریل میں فرانس کے وزیر خارجہ نے قانا پر اسرائیلی بمباری پر صدر شیراک کی ناراضی اسرائیل تک پہنچائی اور پھر اسرائیل اور حزب اللہ میں جنگ بندی کروانے میں کردار ادا کیا۔ پھر

جولائی کے شروع میں جرمنی نے، جس کی ایران سے بات چیت اقتصادی طور پر اس کے لیے یورپی ممالک کے مقابلے میں زیادہ مفید رہی ہے، جنوبی لبنان کی جنگ میں قیدیوں اور لاشوں کے تبادلہ میں اہم کردار ادا کیا۔ کچھ دوسری علامات بھی یورپ کے اس رویے کو ظاہر کر رہی ہیں۔ یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ اسرائیل کی ہر قیمت پر حمایت کی امریکی پالیسی کے نتیجے میں لاکھوں عرب مغرب سے بددل ہوتے جا رہے ہیں۔ امریکہ اور اسرائیل سے بہت پہلے ۱۹۸۰ میں اعلان وینس میں یورپ نے یہ تسلیم کیا تھا کہ امن مذاکرات میں پی ایل او کو شامل کرنا چاہیے جب کہ امریکہ اور اسرائیل اسے دہشت گرد قرار دے رہے تھے۔ ایسے وقت میں جب کہ کارٹر کو اقوام متحدہ میں امریکی سفیر کو صرف اس لیے فارغ کرنا پڑا تھا کہ اس نے پی ایل او کے نمایندے سے نجی ملاقات کر لی تھی، یورپی نمایندے یاسر عرفات کے نمایندوں سے کھلے عام مل رہے تھے۔ ۱۹۸۴ میں پیرس میں یورپ کے وزرائے خارجہ نے فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۸۷ میں یہی وزرائے خارجہ مقبوضہ علاقوں میں بہتر حالات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بون اور کوپن ہیگن میں اپنے مذاکرات میں انھوں نے اسرائیل کے ظالمانہ اقدامات کی مذمت کی جو انسانی حقوق اور بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہیں۔ یورپی ممالک اس موقف پر قائم ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں استحکام کی شرط پر اسرائیل کو قرارداد ۲۴۲ اور ۳۳۸ کے مطابق تمام مقبوضہ علاقے خالی کر دینا چاہییں۔

اسرائیلی بھی امریکہ پر فوجی، سیاسی اور مالی حیثیت سے اپنے کلی انحصار کو مستقل اور دائم نہیں دیکھنا چاہتے۔ اگر کوئی ایسا وقت آیا کہ امریکہ کی خارجہ پالیسی پر اسرائیل کے وہ اثرات نہیں رہے جو آج ہیں، تو اسرائیل کو یورپ کی طرف دیکھنا ہوگا۔ یورپ کی کمزوری یہ ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں کوئی متحدہ پالیسی نہیں اپنا سکا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی دو بڑی قوموں کے خلاف اس کے جرائم بھی بہت واضح ہیں۔ نصف صدی قبل انھوں نے مشرق وسطیٰ کے قدیم مذہب کے حامل اپنے یورپی ساتھیوں کا نام و نشان مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور کون سا مسلمان بھول سکتا ہے کہ صرف ایک سال پہلے ایک یورپی ملک کے فوجیوں نے ان سربوں کے ساتھ شمپین پی جنھیں سربینکا میں ان ہزاروں معصوم جانوں کو ہلاک کرنا تھا جن کی حفاظت اس یورپی ملک کے فوجیوں کی ذمہ داری تھی۔

اس کے باوجود مشرق وسطیٰ کے بہت سے علاقوں میں یورپ کو ایک روشن خیال بین الاقوامی برادری خیال کیا جاتا ہے جس کی دوستی امریکہ کے مقابلے میں زیادہ پایدار ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں نہیں ہو سکتا کہ یہی یورپ ''اسلامی دہشت گردی'' کے خلاف اعلان جنگ کرتا رہے۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ ساتھ اسلام، جنوبی روس سے ترکی تک، بوسنیا سے مراکش تک ہمارے پڑوسیوں کا مذہب ہے۔

گذشتہ دنوں جب میں بیروت میں تھا، مجھے ایک شامی نوجوان نے ایک خط پہنچایا، جو اس نے پوپ پال دوم کو لکھا تھا۔ اس نے بہت احترام اور لحاظ کے ساتھ، ان سے اپیل کی تھی کہ وہ پوپ اربن دوم کی صلیبی جنگوں کی اپیل کے ۹ سو سال پورے ہونے پر مسلمانوں سے صلیبی جنگوں پر معذرت کریں۔ پوپ اربن دوم نے اپنی اس مقدس جنگ کی اپیل میں مسلمانوں کو ایک ملعون اور خدا سے بالکل برگشتہ نسل قرار دیا تھا اور اپنے علاقوں میں اس بدباطن نسل کو مٹانا ایک مقدس فریضہ قرار دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں یورپ کے ممالک نے ۱۹۰ سال تک عربوں، مسلمانوں اور یہودیوں پر ظلم و استبداد کا بازار گرم رکھا۔ اس شامی کا کہنا تھا کہ ان مسلمانوں کی اولاد سے معذرت کے چند الفاظ ان کے جذبات کو ٹھنڈا کریں گے اور پورے علاقے میں امن کی فضا پیدا کرنے میں معاون ہوں گے۔ اس شامی کو پوپ پال دوم سے کوئی جواب نہیں ملا لیکن وہ سوچ سکتا ہے کہ یورپ نے اپنے برے بھلے کا خیال رکھا تو شاید اب دوبارہ صلیبی جنگیں نہیں ہوں گی۔

رسائل و مسائل

جستجوئے حق کا صحیح طریقہ

اگر ایک آدمی حق کی تلاش میں ہے اور وہ دل سے اس کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے کافی جدوجہد کے بعد بھی وہ نہیں ملتا تو کیا وہ بیچارہ حوصلہ ہار نہیں بیٹھے گا؟ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک آدمی انتہائی تاریکی میں اس غرض سے سفر کرتا ہے کہ کہیں روشنی کا چراغ اسے ملے۔ لیکن سفر کرتے کرتے روشنی کا نشان تک اسے نہیں ملتا۔ آخر کو بیچارا تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ روشنی سرے سے ہے ہی نہیں' اگر کچھ ہے تو بس گھپ اندھیرا۔

آپ کہیں گے کہ میں نے یہ ایک محض فرضی مثال پیش کی ہے۔ میں انسانی زندگی سے عملی مثال پیش کرتا ہوں۔ دو آدمی ہیں جو شعوری طور پر اور رسمی طور پر مسلمان ہیں۔ شروع شروع میں دونوں دو حصاروں کے اندر بند ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک حصار زندگی میں مصیبتوں' تکلیفوں اور ناکامیوں کا حصار ہے۔ ایک آدمی پہلے حصار سے باہر نکل آتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اب ایک ہی حصار اس کے لیے باقی ہے جس سے نکل کر وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس طرح اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور جب وہ دوسرے حصار سے بھی باہر نکل آتا ہے تو آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ تجربہ اسے مطمئن کر دیتا ہے اور وہ ایسی ذات کا قائل ہو جاتا ہے جو مصیبت زدہ کی پکار کو سنتی ہے اور مدد کرتی ہے۔ مگر دوسرا شخص ایک حصار سے نکلتا ہے تو دوسرا حصار' اور دوسرے سے نکلتا ہے تو تیسرا حصار اسے گھیر لیتا ہے' یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے پیہم حصار پر حصار اسے گھیرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مسلسل چکر اسے قطعی مایوس کر دیتا ہے اور وہ کسی ایسی ذات سے جو مصیبت میں کام آئے' مکمل طور پر ناامید ہو جاتا ہے' کیونکہ بیچارہ بار بار چلاتا ہے کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ؟ اور کبھی بیچارے کو اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ محض اس لیے ناامید ہو گیا ہے کہ بیچارے کی بیشتر خواہشات میں سے ایک بھی پوری نہیں ہوئی اور جن تکلیفوں میں سے ایک بھی رفع نہیں ہوئی۔ اگر کوئی ایک خواہش بھی پوری ہو جاتی' یا ایک تکلیف بھی رفع ہو جاتی تو وہ اس بات سے کلی طور پر مایوس نہ ہوتا کہ اوپر کوئی بالاتر ہستی دعائیں سننے اور حاجتیں پوری کرنے والی موجود ہے۔

آپ نے اپنے سوال کے آغاز میں جو بات لکھی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حق کی تلاش ایک بنیادی خوبی ہے جو حق پانے کے لیے شرط اول کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ تلاش حق مخلصانہ ہو' بلاتعصب ہو" اور دانش مندی کے ساتھ ہو۔ یعنی آدمی اس تلاش کے دوران میں حق اور باطل کے درمیان تمیز کرتا رہے اور جو چیز باطل نظر آئے اسے چھوڑ کر حق کو قبول

کرتا چلا جائے۔اس صورت میں یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ آدمی کو گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نہ ملے۔

سوال کے دوسرے حصے میں آپ نے جو مثال پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تلاش حق برائے تلاش حق نہیں بلکہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ آپ مصیبتوں اور تکلیفوں اور ناکامیوں کے حصار سے نکل جائیں، اور آپ کو نَصْرُ اللّٰهِ قَرِيْب کی آواز نہ صرف یہ کہ سنائی دینے لگے بلکہ وہ جواب دینے والی ہستی آپ کے مصائب اور تکالیف اور ناکامیوں کا مداوا ابھی کر دے۔

میرے نزدیک تلاش حق کے لیے یہ نقطہ آغاز ہی سرے سے غلط ہے جس کی وجہ سے آپ کو مایوسی لاحق ہوئی ہے۔حق کی تلاش کا صحیح راستہ جو آپ کو اختیار کرنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ:

سب سے پہلے مطالعہ اور غور و فکر سے آپ یہ تحقیق کریں کہ آیا کائنات کا یہ نظام بے خدا ہے؟ یا بہت سے بااختیار خداؤں کی تخلیق سے بنا ہے۔اور وہ سب اس کا نظام چلا رہے ہیں؟ یا اس کا ایک ہی خالق و مالک اور حاکم و منتظم ہے؟

اس کے بعد آپ اس کائنات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ تحقیق کریں کہ آیا یہ دارالعذاب ہے؟ یا عیش کدہ ہے؟ یا دارالامتحان ہے جس میں لذت اور الم، تکلیف اور راحت، کامیابی اور ناکامی، ہر چیز آزمائش کے لیے ہے؟

پھر آپ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ آیا وہ یہاں بالکل آزاد اور مختار مطلق ہے اور کوئی بالاتر طاقت اس کی قسمت پر اثرانداز ہونے والی نہیں ہے اور کسی بالاتر ہستی کے سامنے وہ جواب دہ نہیں ہے؟ یا زمین اور آسمان میں بہت سے خدا اس کی قسمت کے مالک ہیں؟ یا ایک ہی خدا اس کا اور ساری دنیا کا خالق و حاکم ہے، اور وہ مختار مطلق ہے، ہماری لگائی ہوئی شرطوں کا پابند نہیں ہے، اور وہ ہمارے آگے جواب دہ نہیں بلکہ ہم اس کے آگے جواب دہ ہیں، اور وہ یہاں اچھے اور برے سب طرح کے حالات میں رکھ کر ہمارا امتحان لے رہا ہے، جس کا نتیجہ اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں نکلے گا؟

ان تین سوالات میں سے اگر آپ کی تحقیق ہر ایک کا جواب پہلی یا دوسری شکل میں دے تو آپ کو مایوسی کی حالت سے نکل کر امید کا راستہ پانے کی کوئی صورت بتانا میرے بس میں نہیں ہے۔البتہ اگر آپ کی تحقیق ہر سوال کا جواب تیسری شکل میں دے تو یہی جواب آپ کو اطمینان قلب کی منزل تک پہنچا سکتا ہے، بشرطیکہ آپ مزید غور و فکر کر کے اس کے منطقی مضمرات (Logical Implications) کو اچھی طرح سمجھتے چلے جائیں۔

جب خدائے وحدہ لاشریک ساری کائنات کے انتظام کو چلا رہا ہے تو کائنات کی آبادی کے بے

شمار افراد میں سے کسی فرد کا یہ چاہنا ہی سرے سے غلط ہے کہ خدا کی ساری خدائی صرف اس کے مفاد میں کام کرے۔

اور جب یہ دنیا دارالامتحان ہے تو اس میں پیش آنے والی ہر خوشی اور رنج، ہر مصیبت اور راحت، ہر کامیابی اور ناکامی دراصل انسان کی آزمائش کے لیے ہے۔ یہ بات جس شخص کی بھی سمجھ میں آجائے گی، وہ نہ کسی اچھی حالت پر اترائے گا اور نہ کسی بری حالت پر دل شکستہ ہو گا، بلکہ ہر حالت میں اس کی کوشش یہ ہوگی کہ خدا کے امتحان میں کامیاب ہو۔ دنیا کے موجودہ نظام کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد آدمی یہاں ایسی غلط تمنائیں دل میں پالے گا ہی نہیں کہ اس زندگی میں اسے خالص عیش اور بے لاگ لذت اور بے آمیز راحت اور دائمی کامیابی نصیب ہو اور کبھی اسے مصیبت، تکلیف، رنج اور ناکامی سے سابقہ پیش ہی نہ آئے۔ کیونکہ یہ دنیا نہ عیش کدہ ہے اور نہ دارالعذاب کہ یہاں محض لذت یا محض الم، یا محض راحت یا محض تکلیف، یا محض کامیابی یا محض ناکامی کہیں پائی جا سکے۔

اسی طرح جب تیسرے سوال کا جواب آپ تحقیق سے یہ پالیں کہ خدائے واحد خالق و حاکم ہے اور ہم مخلوق و محکوم، اور یہ کہ وہ مختار مطلق ہے، اور ہم اس کے بندے ہوتے ہوئے اسے اپنی شرطوں کا پابند نہیں بنا سکتے، اور یہ کہ وہ ہمارے سامنے نہیں بلکہ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں، تو آپ کا ذہن کبھی خدا سے ایسی غلط توقعات وابستہ نہ کرے گا کہ ہم خود جس حالت میں رہنا چاہیں وہ ہمیں اسی حالت میں رکھے اور ہم جو درخواست بھی اس سے کریں وہ ضرور اسی شکل میں اسے پورا کرے جو ہم نے تجویز کی ہے، اور ہم پر کوئی تکلیف، یا مصیبت اگر آ ہی جائے تو ہمارے مطالبے پر وہ اسے فوراً دفع کر دے۔

مختصر بات یہ ہے کہ صحیح معرفت کا ثمرہ اطمینان ہے جو ہر اچھے یا برے حال میں یکساں قائم رہتا ہے، اور معرفت کے فقدان کا نتیجہ بہرحال بے چینی، اضطراب اور مایوسی ہے، خواہ عارضی طور پر انسان اپنی کامرانیوں سے غلط فہمی میں پڑ کر کتنا ہی مگن ہو جائے۔ آپ مایوسی سے نکلنا چاہتے ہیں تو پہلے حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کی فکر کریں، ورنہ کوئی چیز بھی آپ کو گھپ اندھیرے سے نہ نکال سکے گی۔ (ابو الاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، اگست ۱۹۷۵)

ضلالت و ہدایت

جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر راہ راست پر آیا اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر حتی الامکان چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ بعد میں کچھ دیگر رسائل کے مطالعے سے گمراہ ہو گیا اور کفر کی حد تک جا پہنچا۔ تفہیمات کو کئی بار

پڑھا، مگر الجھن دور نہ ہوئی۔ اس کے بعد ہر قسم کا مذہبی لٹریچر پڑھنا چھوڑ دیا۔ پھر "سنت کی آئینی حیثیت" پڑھنے کو مل گئی۔ اس سے بیشتر شکوک دور ہو گئے اور اب اللہ کے فضل سے احکام الٰہی کی پابندی کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ:

۱۔ جو زندگی میں نے اسلام کے مطابق بسر کی تھی کیا مجھے اس کا کوئی اجر ملے گا یا کفر میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مارا جائے گا۔

۲۔ انسان جب گمراہ ہوتا ہے تو بعض اوقات نیک نیتی سے بھی ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر عام آدمی کو کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ سیدھے راستہ پر ہے یا نہیں۔ راہ حق پر استوار رہنے کی صحیح تدبیر کیا ہے؟

۳۔ دین کی کچھ باتیں اگر عقل تسلیم نہ کرے، تو کیا کرنا چاہیے؟ ایمان تو ہم لا سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں، مگر دل اس سے مطمئن نہ ہو تو کیا کیا جائے؟

یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ انکار حدیث و سنت اور الحاد کی جانب مائل ہو جانے کے بعد اللہ نے آپ کو راہ راست کی طرف آ جانے کی توفیق بخشی۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کو دین حق پر ثابت قدم رکھے اور آیندہ آپ لغزش کا شکار نہ ہونے پائیں۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر آپ انکار و الحاد کی روش پر قائم رہتے، تب تو ظاہر ہے کہ آپ کی سابق اسلامی زندگی کے اعمال بالکل اکارت جاتے، لیکن اب جبکہ ضلالت کا دور مستقل ثابت نہیں ہوا، بلکہ آپ پھر اسلام کی طرف پلٹ آئے ہیں، اس لیے اللہ آپ کو سابق عمل صالح کا بھی اجر دے گا۔ اس بات کی دلیل خود قرآن سے ملتی ہے۔ سورۂ حدید کے آخر میں جن لوگوں کو رسالت محمدیؐ پر ایمان لانے کے نتیجے میں دوہرے اجر کی بشارت دی گئی ہے، بعض مفسرین کے نزدیک ان سے مراد اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب بعثت محمدیؐ سے پہلے تو اسلام پر تھے، مگر آنحضورؐ کی نبوت کے بعد جب وہ فوراً ایمان نہ لائے تو کافر ہو گئے۔ اس کے باوجود اللہ یہ خوشخبری ان کو دیتا ہے کہ اگر تم اب بھی مسلم بن جاؤ تو تمھاری پہلی زندگی کا اجر ضائع نہ ہو گا۔ بعض صحیح احادیث سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے اہل کتاب کے لیے دونا اجر ہے۔

۲۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان بعض اوقات نیک نیتی سے بھی گمراہ ہو جاتا ہے، لیکن ایسی صورت میں اگر تین باتیں انسان میں موجود ہوں تو بالعموم گمراہی کا احساس ہو جانے میں دیر نہیں لگتی۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان اپنی آنکھ، کان اور اپنے دل و دماغ پر تالے ڈال کر نہ رکھے تاکہ جو چیز بھی اس کے سامنے آئے اس کا کھلے دل اور کھلی آنکھ کے ساتھ مشاہدہ کر سکے، خواہ وہ اس کی طبیعت اور مذاق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ انسان جو رائے بھی قائم کرے وہ دیانت داری اور بے لوثی کے ساتھ قائم کرے اور ضمیر کی آواز کو کبھی دبانے کی کوشش نہ کرے۔ بسا اوقات

ایسا ہوتا ہے کہ انسان گمراہی کو محض اس وجہ سے پسند کرتا ہے اور اسے راست روی پر ترجیح دینے کے لیے اس لیے بہانے تلاش کرتا ہے کہ گمراہی اس کے مرغوبات نفس کے مطابق ہوتی ہے یا اس سے انسان کے ذاتی اغراض و مقاصد وابستہ ہوتے ہیں۔ تیسری ضروری بات یہ ہے کہ انسان ہر وقت اللہ سے دعا مانگتا رہے کہ وہ اسے صراط مستقیم دکھائے اور ضلالت سے بچائے۔ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے وقت یہی دعا ہم مانگتے ہیں۔ ہدایت و ضلالت کا اصل سررشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس لیے طلب توفیق ہر حال میں لازم ہے۔

۳۔ بحیثیت مجموعی دین اسلام کے متعلق یہ اطمینان کر لینا کافی ہے کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہے اور اس کی تعلیمات فی الجملہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد ایک ایک حکم اور اس کے ایک ایک جز کے متعلق عقلی اطمینان ضروری ہے، نہ ممکن ہے۔ (ا-م، ترجمان القرآن، مئی ۱۹۶۶)

مصائب کے ہجوم میں ایک مومن کا نقطہ نظر

میرا تیسرا بیٹا پونے چار سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ یہاں آکر پہلے دو لڑکے فوت ہوئے، اب یہ تیسرا تھا۔ اب کسی نے شبہ ڈال دیا کہ جادو کیا گیا ہے۔ جس دن سے یہ بچہ پیدا ہوا اسی دن سے قرآن پاک کی مختلف جگہوں سے تلاوت کر کے دم کرتا رہا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے لڑکے پونے دو سال کی عمر میں فوت ہوتے رہے۔ یہ پونے چار سال کو پہنچ گیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جادو بھی چند الفاظ ہوتے ہیں۔ اس کے توڑنے کو قرآن پاک کے الفاظ تھے۔ پھر دعائیں بھی بہت کیں۔ بوقت تہجد گھنٹوں سجدہ میں پڑا رہا ہوں۔ لیکن کچھ شنوائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات حاضر و ناظر اور سمیع و بصیر ہے۔ کیا حق تعالیٰ جادو کے اثر کے لیے مجبور ہی ہو جاتے ہیں؟ لوگ قبر والوں کے نام کی بودیاں رکھ کر پاؤں میں کڑے پہنا کر اولاد بچائے بیٹھے ہیں لیکن ہم نے اسے شرک سمجھ کر اس کی طرف رجوع نہ کیا۔ لیکن ہمیں بدستور رنج اٹھانا پڑا۔ اکٹھے تین داغ ہیں جو لگ چکے ہیں۔ براہ کرم اس غم و افسوس کے لمحات میں رہنمائی فرمائیں۔

آپ کے صاحبزادے کی وفات کا حال معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا اور اس سے زیادہ افسوس یہ سن کر ہوا کہ اس سے پہلے بھی دو بچوں کا صدمہ آپ کو پہنچ چکا ہے۔ اولاد کے یہ پے در پے غم آپ کے اور آپ کی اہلیہ کے لیے جیسے ناقابل برداشت ہوں گے اس کا مجھے اندازہ ہے اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو صبر عطا فرمائے اور سکینت بخشے۔

آپ کے خط سے مجھے محسوس ہوا کہ دل پر پے در پے چوٹیں کھانے کی وجہ سے آپ غیر معمولی طور پر متاثر ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس حالت میں نصیحت کرنا زخموں کو ہرا کر دیتا ہے، اور مناسب یہی ہوا کرتا ہے کہ رنج و غم کا طوفانی دور ختم ہو جائے۔ مگر مجھے خوف ہے کہ اس دور میں کہیں آپ کے عقائد صالحہ پر کوئی آنچ نہ آجائے۔ اس لیے مجبوراً کہتا ہوں کہ آفات اور مصائب اور آلام کا خواہ کیسا

ہی ہجوم ہو، مومن کو اپنے ایمان اور اللہ کے ساتھ اپنے تعلق پر آنچ نہ آنے دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہم کو ہر طرح کے حالات میں ڈال کر آزماتا ہے۔ غم بھی آتے ہیں اور خوشیاں بھی آتی ہیں۔ مصیبتیں بھی پڑتی ہیں اور راحتیں بھی میسر آتی ہیں۔ نقصان بھی ہوتے ہیں اور فائدے بھی پہنچتے ہیں۔ یہ سب آزمایش ہیں اور ان سب سے ہم کو بخیریت گزرنا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر ہماری کوئی بدقسمتی نہیں ہو سکتی کہ ہم مصیبتوں کی آزمایش سے گزرتے ہوئے ایسے مضطرب ہو جائیں کہ اپنا ایمان اور اعتقاد بھی خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ اس طرح تو ہم دنیا اور دین دونوں ہی کے ٹوٹے میں پڑ جائیں گے۔ آپ کو جن صدموں سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ واقعی دل ہلا دینے والے ہیں۔ لیکن اس حالت میں ثابت قدم رہنے کی کوشش کیجیے اور کوئی مشرکانہ خیال یا شرک کی طرف کوئی میلان، یا اللہ سے کوئی شکایت دل میں نہ آنے دیجیے۔ ہم اور جو کچھ بھی ہمارا ہے، سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ ملکیت بھی اسی کی ہے اور سارے اختیارات بھی اسی کے۔ ہمارا اس پر کوئی حق یا زور نہیں ہے۔ جو کچھ چاہے عطا کرے اور جو کچھ چاہے چھین لے اور جس حال میں چاہے، ہم کو رکھے۔ ہم اس پر اس شرط سے ایمان نہیں لائے ہیں کہ وہ ہماری تمنائیں پوری ہی کرتا رہے اور ہم کو کبھی کسی غم یا تکلیف سے دوچار نہ کرے۔ یہ شان بندگی نہیں ہے کہ اللہ سے مایوس ہو کر ہم دوسرے آستانوں کی طرف رجوع کرنے لگیں۔ دوسرے کسی آستانے پر سرے سے ہے ہی کچھ نہیں۔ وہاں سے اگر بظاہر کچھ ملتا ہے تو خدا ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ البتہ وہاں سے مانگ کر ہم جو کچھ پا سکتے ہیں وہ ایمان کھو کر ہی پا سکتے ہیں۔ اور بہت سے بدقسمت ایسے ہیں جو وہاں ایمان بھی کھوتے ہیں اور مراد بھی نہیں پاتے۔ اس لیے آپ ایسے کسی خیال کو اپنے دل میں ہرگز نہ آنے دیں اور صبر و ثبات کے ساتھ اللہ ہی کا دامن تھامے رہیں۔ خواہ غم نصیب ہو یا خوشی۔

جادو اور آسیب اور جفر وغیرہ میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ آپ اللہ سے دعا مانگتے رہیں۔ اسی سے پناہ طلب کرتے رہیں۔ امید ہے کہ آخرکار اس کا فضل آپ کے شامل حال ہو گا۔ اور کوئی بلا آپ کو یا آپ کی اولاد کو لاحق نہ ہو گی۔ (ا-م، ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۵۸)

کتاب نما

فقہ حضرت ابوبکرؓ، ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی، مترجم: مولانا عبدالقیوم۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ لاہور، صفحات: ۲۷۶۔ قیمت: درج نہیں

فقہ حضرت عمرؓ، ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی، مترجم: ساجد الرحمن صدیقی، ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ لاہور، صفحات: ۹۰۴۔ قیمت: درج نہیں۔

اسلامی فقہ کی شاندار اور طویل تاریخ، مسلمانوں کے قابل فخر اور بلند پایہ علمی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ فقہ کے قدیم علمی سرمائے کو مرتب و مدون کرنے کے لیے، ہمارے بعض علما و فقہا نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ فقہی دائرہ معارف کی تیاری کے لیے، بعض مسلم ممالک خصوصاً شام، مصر اور کویت میں متعدد عظیم الشان علمی منصوبے تیار ہوئے اور بڑی حد تک وہ بروئے کار بھی آئے۔ (ان کی تفصیل فقہ حضرت عمرؓ کے مقدمے میں ملتی ہے) مصنف خود بھی ان میں سے بعض منصوبوں میں شامل رہے، مگر ان کا احساس یہ تھا کہ مسلم ممالک میں مدون ہونے والے مختلف فقہی انسائیکلوپیڈیا میں صحابہؓ و تابعینؒ کی فقہ کو شامل نہیں کیا گیا کیوں یہ کام محنت و مشقت کا تھا۔ اسی احساس کے تحت ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے فقہی اجتہادات کو مرتب و مدون کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور "نہایت گہرے اور تاریک طوفانی سمندر میں قریباً بیس سال تک" غواصی کرنے کے بعد خلفائے راشدین اور امام ابراہیم نخعیؒ (امام ابو حنیفہؒ کے استاد) کی فقہیں مرتب کیں۔ اس سلسلہ تحقیق و تصنیف میں سے دو کتابیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تو تمام صحابہؓ کو آسمان پر چمکنے اور نور بکھیرنے والے ستارے قرار دیا لیکن ان سب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مقام برتر و افضل ہے، اور اسی لیے ان کی بیشتر آرا اور اجتہادات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں بہت سے نئے سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی مسائل میں قانون اور فقہ کی رہنمائی کی ضرورت پیش آئی تو انھیں اجتہاد سے کام لینا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فقہ زیادہ مفصل ہے۔

ادارہ معارف اسلامی نے ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی کی عربی تصانیف کے جو اردو ترجمے شائع کیے

ہیں، ان سے بقول خلیل احمد حامدی مرحوم: "ارباب فقہ و اجتہاد اور اصحاب قانون و قضا کے سامنے نظام شریعت کو سمجھنے کے لیے اور دور اقبال کے فکری اور فقہی سرمائے سے آگاہ ہونے کے لیے نئے دروازے وا ہوں گے۔ یہ کتابیں اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان کے ذریعے علما، قانون، شریعت اور فقہ کے طالب علموں، وکلا اور مصنفین کے سامنے کچھ نئی فقہی تفاسیر آجائیں گی اور معاملات کے تفہیم اور فیصلوں میں نسبتاً آسانی ہوگی۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ عام قاری کے لیے اس کی افادیت محدود ہے۔ بہت سے مسائل پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی آرا فقہ حنفی سے مختلف ہیں بلکہ متعدد مسائل میں شیخین کے باہمی فقیہانہ نقطہ نظر میں بہت کچھ فرق ہے۔ اس اعتبار سے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ کسی خاص فقہ (مثلاً: حنفی جس پر برعظیم کے مسلمانوں کی اکثریت عامل ہے) کے پیروکاروں کے لیے ان کتابوں کی کیا اہمیت ہے؟ (بلکہ علمی و فقہی امور میں گہری نظر سے عاری، اصحاب کے لیے تو کچھ الجھاؤ کا خطرہ بھی ہے)۔ اس سے قطع نظر ان کتابوں کی اشاعت، اردو زبان کے علمی سرمائے میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

سہ ماہی، "**تحقیقات اسلامی**"، مدیر: سید جلال الدین عمری۔ ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ صفحات ۱۲۰۔ زرسالانہ بیرون ملک انفرادی ۳۵۰ روپے۔ ادارے: ۵۰۰ روپے۔ پاکستان انفرادی ۱۵۰ روپے۔ ادارے ۲۰۰ روپے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "ترجمان القرآن" کے اجرا "دارالاسلام" کے قیام اور جماعت اسلامی کے آغاز سے جس دعوتی، علمی اور فکری تحریک کا آغاز کیا تھا علی گڑھ کا ادارہ تحقیق و تصنیف اسی کے تسلسل میں جماعت اسلامی ہند کی اعانت اور فکر اسلامی کے بہترین عالم جناب صدر الدین اصلاحی کی سرپرستی میں قائم اور سرگرم عمل ہے۔ یہ علمی ادارہ نہ صرف برعظیم بلکہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔ اس ادارے کی صورت گری، قیادت، تنظیم اور تحقیقی سرگرمیوں کے قافلہ سالار جناب سید جلال الدین عمری ہیں، جنھوں نے سہ ماہی "تحقیقات اسلامی" کی صورت میں تحقیق و جستجو کے بہت سے امکانات کو بیدار بھی کیا ہے، اور ان کی قلمی تشکیل بھی کی ہے۔ یہ جریدہ عوامی نہیں علمی ہے۔ اس کا اسلوب تجزیاتی و تحقیقی ہے۔

سہ ماہی "تحقیقات اسلامی" میں پیش کردہ تحریریں ایک جانب مقلدانہ طرز فکر کی نفی کرتی ہیں۔ تو دوسری طرف یہ تحریریں اسلامی روایت سے بھی پختگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مجلے میں عموماً ایسے موضوعات کو زیر تحقیق لایا جاتا ہے جن پر بالعموم روایتی مذہبی ادارے اور پرچے سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ بھارت میں کافر تہذیب کے غلبے کے زیر اثر کئی قابل ذکر

اسلامی و مذہبی ادارے مداہنت اور پسپائی کی راہ اختیار کر چکے ہیں اور ان کی تحریروں اور تقریروں اسلامی روایت سے پہلوتہی کا تاثر ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں مجلہ "تحقیقات اسلامی" اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے قرآنی سوچ اور مصطفوی دانش کے زیر سایہ اجتہادی بصیرت کے ساتھ عصری مطالبات کا جواب دے رہا ہے۔ جلال الدین صاحب کے ہمراہ ان کے رفقائے کار اور معاونین قرطاس و قلم میں ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، مولانا محمد جرجیس کریمی، جناب سلطان احمد اصلاحی، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی وغیرہم کی تحریریں قارئین کو علم و دانش کی روشنی فراہم کرتی ہیں۔

مشمولات میں سیرت پاک، مسلم تاریخ کی اسلامی تعبیر، اسلامی معاشیات، تصوف، مسلہ جنس، غیر مسلموں سے مسلمانوں کے باہم ربط و تعلق جیسے موضوعات پر جان دار تحریریں ملتی ہیں۔ عربی سے بعض قیمتی مضامین کے عمدہ اردو تراجم اس پر مستزاد ہیں۔ حیات اجتماعی کے بعض جدید مسائل اور الجھاووں پر اسلامی تحریکات کے لٹریچر میں کچھ خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ اس مجلّے کے دامن میں اس کمی کو دور کرنے کے امکانات نظر آتے ہیں۔ ہماری تجویز ہے کہ ہر شمارے میں اسلام اور عالم اسلام سے متعلق کسی کتاب پر مفصل ریویو اور برعظیم یا بیرونی یونی ورسٹیوں میں ان موضوعات پر تحقیقی مقالات کے نتیجہ فکر کو پیش کرنے کا آغاز کیا جائے۔ اس پرچے کا پاکستانی ایڈیشن شائع ہو، یا پھر اس کی اشاعت سے دلچسپی رکھنے والے افراد اور اداروں کو پرچے کی ترسیل باقاعدہ بنائی جا سکے، تو یہ ایک مفید خدمت ہوگی۔ (سلیم منصور خالد)

مرقع اقوال و امثال، سید یوسف بخاری دہلوی۔ ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹ بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰۔ صفحات: ۱۰۰۸۔ قیمت: ۴۵۰ روپے۔

سید یوسف بخاری کا تعلق اس خانوادے سے ہے جسے شاہ جہان آباد تعمیر کرتے وقت مغل فرماں روا شاہ جہان نے جامع مسجد میں امامت اور تبلیغ کے لیے بخارا سے بلایا تھا۔ امامت آج بھی اسی خاندان کے پاس ہے۔ سید یوسف تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ ملازمت کے ساتھ سلسلہ تصنیف و تالیف بھی جاری رہا۔ اردو سمیت چھ زبانوں (پشتو، پنجابی، فارسی، سندھی اور عربی) کے اقوال و مثال کا یہ مجموعہ مصنف کی نصف صدی کی کاوش و محنت کا ماحصل ہے۔ کسی ایک اردو قول یا ضرب المثل کے جو مترادفات دوسری پانچ زبانوں میں ملتے ہیں انھیں تلاش کر کر کے عنوانات وار یکجا کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ نگار جمیل الدین عالی کے بقول: "اردو میں اب تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس میں اردو کے اتنے محاورے، اقوال اور امثال، دوسری زبانوں کے اتنے مترادفات کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں"۔

مولف نے بڑے قابل قدر جذبے کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے۔ بظاہر یہ ایک علمی اور ادبی کام ہے لیکن اس کی انجام دہی میں یوسف بخاری مرحوم کے ذہن میں ایک مقصدیت کار فرما تھی۔ ان کے نزدیک: "پاکستان کی سالمیت و بقا کا تمام تر دار و مدار دین اسلام' اسلامی نظام' متحدہ ثقافت اور پاکستان کے صوبوں اور علاقوں میں بولی اور لکھی جانے والی تمام زبانوں ہی پر ہے"۔ تقریباً ۲۵ ہزار امثال و اقوال کو ۱۸۶ عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے' جیسے: عبادت' دعا' اتحاد' رشوت' وطن' حرص و ہوس' امید و یاس' نظم و نسق' استغنا' احتیاط اور صحت وغیرہ۔ طلبا اور اساتذہ کے علاوہ عام قارئین کے لیے بھی یہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ معلومات کے ساتھ' قاری کی زبان دانی کی صلاحیت و مہارت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں ایک سیر حاصل مقدمہ شامل ہے جس میں ضرب المثل' محاورہ اور قول کی اہمیت' ان کی پیدائش کے اسباب اور ان کے ماخذ وغیرہ پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

(ر - ہ)

پاکستانی معاشرہ ' لائحہ عمل کی تلاش میں، محمد موسیٰ بھٹو۔ ناشر: نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ ' ۱۱۸۶ پیپلز کالونی ' لطیف آباد' حیدر آباد۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۲۰ روپے۔

سندھی دانش ور اور اسکالر محمد موسیٰ بھٹو کی بعض تصانیف پر انھی صفحات میں تبصرہ آ چکا ہے (مثلاً: معاشرہ' جدیدیت اور اسلام فروری ۹۵)۔ زیر نظر مجموعہ مضامین پاکستان کے چند اہم ملی اور قومی مسائل سے متعلق ہے۔ پاکستانی معاشرہ ایک شدید بحران کا شکار ہے' مگر ایسا کیوں ہے؟ مصنف کے نزدیک نفس پرستی کی مقامی اور عالم گیر قوتیں باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت مسلم معاشرے کو حیوانیت کے درجہ اسفل السافلین کی طرف دھکیل رہی ہیں تاکہ اسلامی روایات اور اسلاف سے ان کا رشتہ منقطع کر کے خیر و صداقت اور اسلام و ایمان کے راستے مسدود کر دیے جائیں۔ کچھ اور بیماریاں ہیں جو معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں: کرپشن' دولت پرستی' سادہ زندگی اور قناعت کا خاتمہ' مجاہدانہ زندگی سے دست برداری اور مسرفانہ زندگی کی غلامی' اختلاف کی برداشت اور صبر و تحمل اور بردباری کی کمی' لسانی قومیت کی تحریکیں' جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے ٹھاٹھ باٹھ وغیرہ وغیرہ۔ جناب بھٹو اس مایوس کن صورت حال کا حل یہ بتاتے ہیں کہ دین کی بنیادی دعوت کے کام میں تیز رفتاری پیدا کی جائے' دین کی پاکیزہ تعلیمات کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ادارے اور جماعتیں گہری منصوبہ بندی کریں اور تربیت کا ایک اعلیٰ نظام قائم کیا جائے جو "صاحب دل' صاحب نظر اور صاحب تقویٰ افراد کے سپرد ہو"۔ وہ سمجھتے ہیں کہ منکر اور برائی کے خلاف سب سے بڑا اور پہلا محاذ اپنی ذلت اور اپنا گھر ہے۔ انھیں افسوس ہے کہ "اسلامی تبدیلی کے علم بردار اکثر حضرات اپنی ذات اور اپنے گھروں میں

مغربی تہذیب کے مظاہر کو روکنے میں نہ صرف کامیاب نہیں ہوتے ہیں، بلکہ انھیں اس کی فکر بھی نہیں ہے"۔ وہ دیگر تراکیب کے ساتھ ساتھ گھر میں روزانہ اہل خانہ کے ساتھ ذکر و فکر کی مجالس منعقد کرنے پر بھی زور دیتے ہیں۔

ایک مضمون میں معروف سندھی شاعر اور دانش ور شیخ ایاز کی نئی کتاب "تو پشت پناہ اور تو سایہ" (دعاؤں کا مجموعہ) کا تعارف کرایا گیا ہے۔ شیخ موصوف ایک زمانے میں سندھ میں ترقی پسندی اور مذہب بیزاری کی علامت سمجھے جاتے تھے اور ان کی شاعری نے ہزاروں نوجوانوں کے ذہنوں میں تشکیک کے کانٹے بوئے۔ جناب بھٹو، ان کی کتاب کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ یہی شیخ ایاز اب توحید پرست اور اسلام کے علمبردار بن چکے ہیں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ـــــــ ان کے نزدیک کراچی کے مسئلے کا حل "ایمان، عمل صالح، اخلاقی قوت اور انسانی اقدار" میں مضمر ہے۔

اہم بات تو یہ ہے کہ مصنف کی تحریر میں دردمندی اور اپنے معاشرے کے ساتھ ہمدردی کا وہ گہرا جذبہ موجود ہے جو کسی تحریر کو پر تاثیر بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ (ر-ھ)

Business Ethics in Islam، مشتاق احمد، ناشر: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اور انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس، ۲۸ ایف - ۱۰/ ۲- اسلام آباد- صفحات: ۲۱۰- قیمت: درج نہیں۔

اسلامی یونی ورسٹی ملائیشیا اور جامعہ پشاور کے ڈاکٹر مشتاق احمد کا یہ پی ایچ ڈی تحقیقی مقالہ ٹمپل یونی ورسٹی میں ڈاکٹر اسماعیل فاروقی کی رہنمائی میں ۱۹۸۰ میں لکھا گیا تھا۔ ۱۹۹۵ میں صاحب مقالہ کے انتقال کے بعد، پروفیسر شریف المجاہد اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اسے ایڈٹ کیا، اب مذکورہ بالا دو وقیع اداروں کے باہمی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

تجارت ہمیشہ سے ہی انسانی زندگی کی اہم سرگرمی رہی ہے؟ لیکن آج کے دور میں تو اس نے اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ اہم بین الاقوامی سیاسی فیصلوں کے پیچھے اسی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام نے تجارت کی حوصلہ افزائی کی ہے لیکن مسلم تجار کے لیے، زندگی کی ہر سرگرمی کی طرح، تجارت کے لیے بھی حدود اور ہدایات ہیں۔ جدید دور میں تجارت کے جو نئے ادارے، طریقے اور تکنیک رائج ہوئے ہیں ان کے بارے میں سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ یہ کہاں تک جائز ہیں۔ ضرورت ہے کہ تجارت کے اسلامی نظریے کو ایسی واضح شکل میں پیش کیا جائے کہ جدید تجارت کے کسی بھی طریقے کو اس پر پرکھا جا سکے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر بہت کچھ لوازمہ موجود ہے، خود قرآن سے بھی واضح رہنمائی ملتی ہے، لیکن اخلاقی تعلیمات کو اس دور کی تجارت کے تقاضوں کے تحت، تجارت کی اخلاقیات کے تحت منظم کرنے کا کام نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد مرحوم کے اس مقالے

نے یہی ضرورت پوری کی ہے۔

کتاب کے دس ابواب ہیں۔عمل اور تجارت کی اہمیت 'تصور خدا' تجارت کا قرآنی تصور' دولت کا قرآنی تصور' تقسیم دولت اور اس کے معاشرے پر اثرات' جائز تجارتی طریقے' ناجائز تجارتی طریقے' قرآنی اصولوں کی تنفیذ اس میں ریاست کا کردار سے اس تحقیق کے میدان اور وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔کتاب کے مطالعے سے اسلامی معاشرے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے جہاں ایک مسلم تاجر کے لیے حکومت کا خوف یا دولت کمانے کی دھن اصل محرک نہیں ہوتی' بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنا اور انصاف سے آگے بڑھ کر احسان کی روش اختیار کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔اسلامی تصور حیات میں آخرت کی زندگی کو جو مقام حاصل ہے وہ تاجر کے پیش نظر ہو تو یہ اسے راہ راست پر رکھنے کی ضمانت ہے۔اس کا وجود معاشرے کے لیے سرچشمہ خیر ہوتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس موضوع پر مختلف ماخذ سے حاصل کردہ اتنی معلومات کسی اور جگہ جمع نہیں۔نہ صرف تاجر پیشہ طبقے کے لیے بلکہ ان ریاستوں کے لیے بھی جو اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنا چاہتی ہوں' اس کتاب میں بہت کچھ رہنمائی ہے۔ایم بی اے بلکہ بی کام کے لیے درسی کتاب کی حیثیت سے بھی غور کیا جانا چاہیے۔(مسلم سجاد)

سہ ماہی **تحقیق**' مدیر: ڈاکٹر نجم الاسلام۔ناشر: شعبہ اردو' سندھ یونی ورسٹی' جام شورو' حیدر آباد سندھ۔ شمارہ: ۸'۹۔صفحات: ۵۹۴۔قیمت: ۷۰ روپے۔

زیر نظر شمارے میں ایک خصوصی گوشے کے علاوہ مقالات' متون اضافات' مکتوبات اور اضافی یادداشتوں کے حصے شامل ہیں۔خصوصی گوشہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (وفات ۱۹۵۵) کے لیے مختص ہے۔مرحوم نے علم و ادب کے مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں' جن کا اعتراف اور قاضی صاحب کو خراج تحسین' قوم پر ایک قرض تھا' جسے مجلہ تحقیق نے ہم سب کی طرف سے ادا کر رہا ہے۔

مقالات کے حصے میں ڈاکٹر نجم الاسلام کا مقالہ "دیوان غمگین کس غمگین کا ہے؟" تحقیق میں "کاتا اور لے دوڑی" کی روش پر ایک سنجیدہ علمی تنقید کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ڈاکٹر نجم الاسلام کی تحقیقی نگارشات سے ہمیں اردو تحقیق کے مستقبل میں روشنی کی کرنیں چمکتی دکھائی دے رہی ہیں۔اس شمارے میں انھوں نے مخبر الواصلین اور آٹھ رسائل طب پر مشتمل ایک قلمی مجموعے کا تعارف پیش کیا ہے۔اضافے اور یادداشتیں قلم بند کی ہیں اور اپنے نام ڈاکٹر نذیر احمد کے خطوط مدون کر کے اردو دنیا کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔

ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کی شائع کردہ کتاب ''اردو میں فنی تدوین'' اپنے موضوع پر پہلی اور قابل قدر کتاب ہے۔ تاہم اس میں بعض ایسے تسامحات راہ پا گئے ہیں جو اس کتاب کو اپنے موضوع پر مثالی کتاب قرار دینے کی راہ میں حائل ہیں۔ ڈاکٹر عطا خورشید نے ۲۹ صفحات کے مقالے میں ایسے تمام تسامحات کی نشاندہی کی ہے، اور ایک علمی کتاب کے محاکمے کا حق ادا کر دیا ہے۔ آخر میں مذکورہ کتاب کا ایک اغلاط نامہ بھی مرتب کر دیا ہے۔

دیگر مقالات میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کا ''اردو کی اولین نسوانی خود نوشت'' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا ''تکملہ مقالات الشعراء'' ڈاکٹر نذیر احمد کا ''سید ابوالعلا اکبر آبادی'' اور حافظ منیر احمد خان کا ''میر رستم علی خان تالپر کی ایک اہم دستاویز'' شامل ہیں۔

غرض یہ کہ زیر نظر مجلہ اردو ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ کمپوزنگ میں لفظوں کو قدرے جلی کر دیا جائے اور پیسٹنگ میں صفحات کی قطع و برید، احتیاط سے کی جائے تو رسالے کے مطالعے میں مزید سہولت پیدا ہو سکتی ہے۔ (زاہد منیر عامر)

صباحی خطابات، محمد انور علوی۔ ناشر: اسلامی نظامت تعلیم، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۱۵۰۔ قیمت درج نہیں۔

چیئرپرسن اور خواتین اور طالبات کی اہمیت کے اس دور میں اسلامی نظامت تعلیم کو مختصر تقریروں کی اس کتاب میں ہر تقریر کو ''محترم پرنسپل صاحب، اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ'' سے آغاز کر کے طالبات کے اسکولوں کو نفسیاتی طور پر اس سے خارج نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چار چار، پانچ پانچ منٹ کی تقاریر کے یہ متن اس لیے فراہم کیے گئے ہیں کہ اساتذہ طلبہ کو یاد کروا کے مارننگ اسمبلی میں تقریر کروائیں، تاکہ عام طلبہ کی علمی و اخلاقی تربیت بھی ہو اور بولنے والوں کی تقریری مشق بھی۔ اس کتاب میں ۳۲ موضوعات لیے گئے ہیں جو عقائد، ارکان اور حقوق سے متعلق ہیں (غیر مسلموں اور جانوروں کو ایک ہی موضوع بنانے پر جائز اعتراض ہو سکتا ہے)۔ تاریخ ساز شخصیات اور ملی اور قومی ایام کے لیے آیندہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ فن تقریر کی کتابوں میں سکھایا جاتا ہے کہ تقریر کے آغاز کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ سامعین کو اپنی طرف ابتدا ہی میں متوجہ کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر اس توجہ کو ہٹنے نہ دینا بھی مقرر کا کمال ہوتا ہے۔ روایتی انداز سے دینی موضوع کا بیان یہ تقاضا پورا نہیں کرتا۔ بڑا اچھا ہوتا اگر کیلنڈر سامنے رکھ کر ۱۸۰ موضوعات کا انتخاب کیا جاتا، ان پر اسمبلی کا ۱۰، ۱۵ منٹ کے پروگرام کا خاکہ دیا جاتا جس میں ایک ۵ منٹ کی تقریر ہوتی۔ چند متنوع موضوعات کا پہلی ہی کتاب میں آنا اس روایت کے عام ہونے کا سبب ہوتا۔ اس وقت یہ دینی معلومات کی محض ایک کتاب ہے۔ ان تقریروں

کا روئے سخن اصل میں تو طلبہ کی طرف ہے ' اس اعتبار سے تقاریر کے درمیان میں "حضرات محترم" ' "جناب والا" اور "جناب عالی" کے بجائے "دوستو ' طالب علم ساتھیو ' پیارے ساتھیو" وغیرہ جیسے الفاظ دہرانا زیادہ مناسب ہوتا ۔ ص ۳۶ کی آخری سطر میں ایک فاش غلطی کی اصلاح ضروری ہے ۔ ہزاروں لاکھوں طلبہ و طالبات کی شخصیت سازی کے لیے تیار کیے جانے والے ان مختصر خطابات سے ملی و قومی شعور ' حالات حاضرہ جاننے کی پیاس ' کچھ بننے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ بیدار ہونا چاہیے تھا ۔

(م ۔ س)

یہ ہے مغربی تہذیب ! ' ڈاکٹر عبدالغنی فاروق ۔ ناشر: ادارہ منشورات اسلامی ' بالمقابل منصورہ ' ملتان روڈ ' لاہور ۔ صفحات: ۸۰ ۔ قیمت: ۱۲ روپے ۔

مغربی تہذیب کی چکاچوند نے نگاہوں کو خیرہ اور اس کی ترقی اور ایجادات نے عقل کو محو حیرت کر دیا ہے --- مصنف نے دوسرے پہلو یعنی ' خاندانی زندگی کی تباہی ' جرائم اور بچوں اور عورتوں پر ظلم و ستم کو اعداد و شمار کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ تبصرہ نگار کے نزدیک اہل مغرب کی اس لحاظ سے تحسین کرنا چاہیے کہ وہ اپنا سب کچا چٹھا لاگ لپیٹ کے بغیر کھول کر سب کے سامنے رکھ دیتے ہیں ۔ چنانچہ ہم اپنے معاشروں میں ہونے والے ظلم ' ستم اور زیادتیوں سے زیادہ ' اہل مغرب کے بارے میں جانتے ہیں (اگر آج بوسنیا کے مظالم مغرب خود نہ بتائے تو مسلم دنیا کے اپنے کون سے ذرائع ہیں؟) ۔ ہمارے تحقیق کاروں کو ' تحقیقی اداروں اور جامعات کو اپنے معاشروں کے زندہ اور اجتماعی مسائل پر تحقیق کی روایت قائم کرنی چاہیے ۔ کیوں نہ کوئی کتاب سامنے آئے: یہ ہے پاکستانی معاشرہ ! (لیکن شاید اس میں کچھ زیادہ محنت کرنا پڑے گی) --- اگر مصنف اس پر بھی بحث کرتے کہ اس سب کے باوجود مغرب کا طوطی کیوں بول رہا ہے ' تو مفید ہوتا ۔ (م ۔ س)

مدیر کے نام

اسحاق منصوری، کراچی

تحریک اسلامی کے مستقبل سے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی (اگست ۹۶) کا موضوع، تحقیق و تدقیق، گہرائی اور گیرائی کا متقاضی ہے۔ سرسری انداز کے بجائے سائنسی تجزیاتی انداز اختیار کیا جائے اور بات کو مثال سے واضح کیا جائے۔ بہرحال خوشی ہوئی کہ 'سب ٹھیک ہے' شائع کرنے کو تحریک کی خدمت سمجھنے کے بجائے، ہم خود پر تنقید شائع کرنے کی ہمت پیدا کر رہے ہیں۔

غلام عباس، جھنگ

'اخبار امت' کے مضامین فکری اور تعمیری ہوتے ہیں۔ مسلم امت کے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مسلم تاریخ کے سنہری ادوار پر سلسلہ وار مضامین بھی قارئین پسند فرمائیں گے۔

غلام ربانی، شنکیاری، مانسہرہ

عرصہ دراز سے دینی و علمی رسائل کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ احساس بافات میں تو سب یکساں ہیں لیکن تلافی مافات کی سبیل ترجمان میں ہی مدلل، دل نشیں اور پر اعتماد انداز سے بتائی جاتی ہے۔

محمد جمیل رانا، قلعہ دیدار سنگھ

پاکستان، پچاسویں سالگرہ پر (اگست ۹۶) بہت خوب تھا۔ حقائق کا بیان تھا۔ ساتھ ہی عوام کے شعور کو جھنجھوڑا، مایوسی سے نکالا اور لائحہ عمل سامنے رکھا۔

ڈاکٹر احمد سعید خان غوری، لاہور

مضامین میں حوالہ جات مکمل طور پر درج ہونا چاہییں۔ مثال کے طور پر اکنامسٹ لندن کے ساتھ شمارے کی تاریخ اشاعت دینا ضروری تھا۔

مختار مسعود، لاہور

پابندی سے مل رہا ہے۔ شوق سے پڑھتا ہوں۔ ہر شمارہ میرے علم میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

ظہیر احمد، فیصل آباد

علمائے اسلام کے حالات اور ان کی علمی خدمات پر مضامین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

محمد نذیر، پشاور

اشعار کی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے' درست ہے۔ ظلمت غلط درج ہوا ہے (ص ۹، اگست ۹۶)


قومی مشروب
نورس
لذت
ٹھنڈک
اور
تازگی
کے لئے
یہی بہتر انتخاب ہے

REGD. NO. L 5340 PHONES : 7587916
7585590
MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE